سہ ماہی

پیغام ثقلین



لعل و گہر

- بُخل ننگ و عار ہے اور بُزدلی نقص و عیب ہے اور غُربت زیرک و دانا مرد کی زبان کو دلائل کی قوت دکھانے سے عاجز بنا دیتی ہے۔ اور مُفلس اپنے شہر میں رہ کر بھی غریب الوطن ہوتا ہے اور عجز و درماندگی مُصیبت ہے اور صبر و شکیبائی شجاعت ہے اور دُنیا سے بے تعلقی بڑی دولت ہے اور پرہیزگاری ایک بڑی سپر ہے۔
- تسلیم و رضا بہترین مُصاحب اور علم شریف ترین میراث ہے اور علمی و عملی اوصاف نو بنو خلعت ہیں اور فکر صاف و شفاف آئینہ ہے۔
- عقلمند کا سینہ اس کے رازوں کا مخزن ہوتا ہے اور کُشادہ رُوئی محبت و دوستی کا پھندا ہے اور تحمّل و بُردباری عیبوں کا مدفن ہے۔
- جو شخص خود اپنے کو بہت پسند کرتا ہے وہ دُوسروں کو ناپسند ہو جاتا ہے اور صدقہ کامیاب دوا ہے اور دُنیا میں بندوں کے جو اعمال ہیں وہ آخرت میں اُن کی آنکھوں کے سامنے ہوں گے۔
- لوگوں سے اس طریقے سے ملو کہ اگر مر جاؤ تو تُم پر روئیں اور زندہ رہو تو تمہارے مُشتاق ہوں۔
- دشمن پر قابو پاؤ تو اس قابو پانے کا شکرانہ اُس کو معاف کر دینا قرار دو۔
- جب تمہیں تھوڑی بہت نعمتیں حاصل ہوں تو ناشکری سے انہیں اپنے تک پہنچنے سے پہلے بھگا نہ دو۔

میں تمہارے درمیان دو گرانقدر چیزیں (ثقلین) خدا کی کتاب اور اپنی عترت و اہل بیت کو چھوڑ کر جا رہا ہوں جب تک تم ان دونوں سے متمسک رہو گے کبھی گمراہ نہ ہو گے اور یہ دونوں میرے پاس حوض کوثر پر وارد ہونے تک ہرگز جدا نہ ہوں گے۔ (مرسل اعظم ص)

سہ ماہی

پیغامِ ثقلین

نئی دہلی

مدیر: سید محمد عسکری

معاونین: سید حسنین رضوی کراروی، ممتاز علی غازی پوری

مقاصد

- مومنین میں دینی رجحان کو فروغ دینا
- نسل نو کو قرآن کریم اور اہل بیت کی پاکیزہ و جاودانی تعلیمات سے زیادہ سے زیادہ آشنا کرنا
- جدید شیعہ نسل میں دینی اور دنیوی تعلیم کو عام کرنا اور ان میں دین کی طرف سے پیدا شدہ احساس کمتری کو دور کرنا
- دنیا بھر میں موجود شیعہ اداروں اور تنظیموں سے روشناس کرانا
- اسلامی دنیا کے آثار و شخصیات کا تعارف کرانا

سالانہ بدل اشتراک	قیمت فی شمارہ ۳۰ روپے
ہندوستان ۱۲۰ روپے دیگر ممالک ہوائی ڈاک ۲۵ ڈالر	پاکستان ہوائی ڈاک ۳۰۰ روپے 〃 〃 زمینی ڈاک ۱۹۰ روپے

پیغام ثقلین سے متعلق تمام قانونی کارروائی دہلی عدالت میں ہی عمل میں آئے گی "ادارہ"

ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر، پروپرائٹر سید محمد عسکری نے نیو پبلک پریس دہلی ۶ سے چھپوا کر اہل بیت کمپلیکس کالندی کنج روڈ، ابوالفضل انکلیو II (شاہین باغ) جامعہ نگر (اوکھلا) نئی دہلی ۲۵ سے شائع کیا۔

خط وکتابت اور زرِ اشتراک بھیجنے کا پتہ: فون نمبر: ۶۹۴۵۱۹۸
الِ بیت کلچرل کمپلیکس، کالندی کنج روڈ، ابوالفضل انکلیو II (شاہین باغ)
جامعہ نگر (اوکھلا) نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

مطابق   مئی، جون، جولائی ۱۹۹۷ء   شمارہ ۳

نقوشِ عصمت

شخصیات

بزمِ آگہی

سہ ماہی
پیغامِ ثقلین
نئی دہلی

جلد ۴ محرم، صفر، ربیع الاول ۱۴۱۸ھ

ترتیب

پیغامِ ثقلین

قرآن کریم

ہدایات

فکر و نظر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ادارہ کا مقالہ نگار کی ہر رائے سے اتفاق ضروری نہیں ہے۔ مندرجات "پیغام ثقلین" نقل کرنے کی اجازت ہے لیکن رسالہ کا حوالہ ضروری ہے۔

این حسینؑ کیست

کہ عالم ہمہ دیوانۂ اوست

محرم کا چاند نمودار ہوتے ہی اپنے پرائے چھوٹے بڑے، عورتوں اور مردوں کی زبان پر نامِ حسینؑ آجاتا ہے۔ ذہنوں میں حق و صداقت کی حمایت کا جذبہ پروان چڑھنے لگتا ہے اور باطل سے نفرت کی امنگوں کو اظہار کا راستہ ملتا ہے۔ چونکہ عالمِ انسانیت میں کوئی ایسا خطہ نہیں ہے جو آزادیٔ ضمیر کے متوالوں اور حریتِ فکر کے پرستاروں سے یکسر خالی ہو۔ لہٰذا جہاں جہاں انسانیت پائی جاتی ہے اور اخلاقی قدروں کی پابندی ہے، وہاں وہاں حریتِ ضمیر اور آزادیٔ فکر و ذہن کے عظیم قائد حضرت امام حسین علیہ السلام سے قلبی لگاؤ، عقیدت اور ان کے تئیں تشکر کے جذبات پائے جاتے ہیں۔ اور باطل کے خلاف نبرد آزمائی میں حسینؑ کو حق کا نمائندہ تسلیم کیا جاتا ہے کیونکہ حق و باطل کی اس دیرینہ کشمکش میں امام حسین علیہ السلام نے وہ عظیم کردار ادا کیا ہے جس کے نتیجہ میں ادیان و مذاہب، رنگ و نسل اور طبقاتی ٹکڑیوں میں بٹی ہوئی فکریں ایک مرکز پر مجتمع ہو گئیں اور اختلاف کے تناظر میں اپنی شناخت کرانے والوں نے بھی آکر اس در پر اپنی جبینِ عقیدت ٹیک دی۔

امام حسینؑ جو ۲۸ صفر ۵۰ھ یعنی اپنے برادر بزرگوار امام حسن علیہ السلام کی شہادت تک لشکرِ حق کے ایک سپاہی کی حیثیت سے رہبرِ حق کے شانہ بشانہ الٰہی اقدار کی پاسداری کر رہے تھے۔ بھائی کے شہید ہوتے ہی رہبریت کی عظیم ذمہ داری سنبھالتے ہیں اور بھائی کے جنازہ پر تیر بارانی کے باوجود صبر و ضبط سے کام لیتے ہوئے اپنے ماں جائے کو جنت البقیع میں سپردِ خاک کر دیتے ہیں۔ آپ نے اپنے غیر معمولی صبر و تحمل سے مسلمانوں میں شعلہ ور ہوتی ہوئی تفرقہ کی آگ کو ہی نہیں بجھایا، بلکہ اپنی تدبیر سے فتنہ پروری کا سدباب کرتے ہوئے اپنے حامیوں کی دانشمندانہ

اطاعت و فرمانبرداری اور امام برحق کے لیے ان کی معرفت کا بے مثال نمونہ بھی پیش فرمایا اور اپنی حکمت عملی سے اپنے اوپر لگائے جانے والے جنگ پسندی کے الزام کو دھو دیا۔

کیونکہ اس بات سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ آدمی اسی وقت تک اپنے مزاج کے خلاف حالات کو برداشت کر سکتا ہے جب تک حالات خود اس کے اپنے اختیار میں نہ ہوں اور فیصلہ کا حق کسی اور ذات کو ہو۔ امام حسن علیہ السلام کی صلح میں مزاج امامت اور منشاء پروردگار کے ارتباط سے ناواقف افراد امام حسینؑ کے کردار کو ضمنی قرار دے سکتے ہیں۔ امامؑ کی رضا کو ایک جبری عمل سے تعبیر کر سکتے ہیں لیکن اب جبکہ یہ عظیم منصب خود آپ کے اپنے ہاتھوں میں ہے، مددگاروں کی کمی نہیں ہے، غیر جانبداری کی سیاست پر کاربند افراد بھی حمایت میں آستین الٹے نظر آ رہے ہیں اور امام حسنؑ کو زہر دیا جانا ہی حالات کو آپ کے حق میں موڑنے کے لیے کافی تھا رہی سہی کسر جنازہ پر بلوائیوں کی تیر باران نے پوری کر دی۔ دنیوی سیاست کے تناظر میں افراد کی تقسیم اور لوگوں کی ہمدردی حاصل کرنے کا اور اسی بہانے دیرینہ مظالم کا حساب چکانے کا بہترین موقع تھا۔ اس مقام پر اگر امامؑ کوئی اقدام نہ بھی فرماتے اور مسائل کو حالات کے اوپر چھوڑ دیتے تو بھی الزام تراشوں کے نظریہ کے مطابق (معاذ اللہ) امامؑ کا جنگ طلبی کا مقصد پورا ہو جاتا، قاتلوں سے انتقام لے لیا جاتا اور جنگ پسندی کا الزام بھی نہ لگتا۔

لیکن امام حسین علیہ السلام نے اپنے الٰہی صبر و تحمل سے جنگ کی آگ کو شعلہ ور نہیں ہونے دیا اور جذبات کے اظہار اور انتقام گیری کے حق پر مرضی پروردگار کو مقدم رکھا۔ اس لیے کہ غنیم نے ابھی تک اسلام کا لبادہ اتار کر پھینکا نہیں تھا۔ امامؑ نے اسلام کا اوڑھنا اوڑھے ظاہراً اس پر عمل کرنے والوں کے خلاف تلوار اٹھانے سے پرہیز کیا تھا لیکن جب رجب ۶۰ھ میں معاویہ نے انتقال کے وقت شرائط صلح کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اپنے شرابی، زناکار اور فسق و فجور میں ڈوبے بیٹے یزید کو اپنا جانشین مقرر کیا تو اس کے علانیہ فاسق و فاجر ہونے کو خود آپ نے مطالبۂ بیعت کے وقت ولید سے اپنی گفتگو میں انتہائی صاف گوئی سے بیعت سے انکار کی ایک وجہ کے طور پر بیان کیا۔ ارشاد فرماتے ہیں:

ایها الامیر انا اهل بیت النبوة ومعدن الرسالة ومختلف الملائکة بنا فتح الله وبنا ختم ویزید رجل شارب الخمور وقاتل النفس المحترمة معلن بالفسق والفجور ومثلی لا یبایع مثله...

اے حاکم ہم ہی تو اہل بیت نبوت اور رسالت کا سرچشمہ ہیں، ہمارے ہی گھر فرشتے آتے اور وحی کا نزول ہوا۔ آفتاب اسلام ہمارے ہی گھر سے طلوع ہوا اور ہمارے ہی ہاتھوں عالمگیر ہوگا۔ تو مجھ جیسے سے یزید کی بیعت کی توقع رکھتا ہے؟ وہ شرابی ہے، بے گناہوں کا قاتل اور احکام اسلام کو پارہ پارہ کرنے والا ہے۔ وہ علانیہ فسق و فجور کرتا ہے

کیا میں اپنی خاندانی عظمت و رفعت اور گزشتہ اسلامی خدمات کے بعد یزید جیسے شخص کی بیعت کر سکتا ہوں۔
اگرچہ امام علیہ السلام یزید سے پہلے امت کی گردن پر مسلط حکمرانوں کی فرماں روائی پر بھی راضی نہیں تھے، لیکن چونکہ وہ اسلام کا علانیہ مضحکہ اڑانے سے پرہیز کرتے تھے۔ لہٰذا امامؑ نے صبر سے کام لیا اور مصلحت دین کی خاطر خاموش رہے۔ لیکن یزید کے کھلم کھلا شراب خواری، قمار بازی، زنا کاری، کتوں اور بندروں سے کھیلنے کی عادت اور ضروریاتِ دین و مذہب کی توہین و تضحیک نے آپ کو اس کی تخت نشینی کے روز اول ہی امت کو اس کے کالے کرتوتوں سے آگاہ کرنے پر مجبور کیا۔ آپؑ یزید کی تخت نشینی پر خاموش مسلمانوں کی بے حسی کا شکوہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

انا للّٰہ وانا الیہ راجعون وعلی الاسلام السلام اذا بلیت الامۃ براع مثل یزید

"اگر یزید جیسا شخص مسلمانوں کا حکمران بن جائے تو اسلام کو سلام آخر۔۔۔"

یقیناً یزید کو خلیفۂ رسول اور جانشین پیغمبرؐ کے عنوان سے پیش کیے جانے سے بڑی اور کون سی مصیبت ہو سکتی ہے۔ اب تک امامؑ کی خاموشی صرف دین کو بچانے اور امتِ مسلمہ کو تفرقہ اور پھوٹ سے محفوظ رکھنے کی خاطر تھی لیکن جب آپ نے دیکھا کہ جس خاموشی سے اب تک دین کی حفاظت ہو رہی تھی وہی دین کے لیے نقصان دہ ثابت ہو گی تو آپ باطل کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے اور لوگوں کے شکوک و شبہات دور کرنے کے لیے کہ کہیں وہ ہماری تحریک کی غلط ترجمانی نہ کریں بہ بانگِ دہل اپنی تحریک کا مقصد بھی واضح کر دیا:

انی لم اخرج اشرا و بطرا ولا مفسدا ولا ظالما وانما خرجت لطلب الاصلاح فی امۃ جدّی اریدان آمر بالمعروف وانھیٰ عن المنکر واسیر بسیرۃ جدّی وابی علی ابن ابی طالب فمن قبلنی بقبول الحق فاللّٰہ اولیٰ بالحق ومن رد علیّ ھذا اصبر حتیٰ یقضی اللّٰہ بینی وبین القوم وھو خیر الحاکمین۔

"میں جاہ طلبی اور خود خواہی کے لیے وطن چھوڑ رہا ہوں اور نہ ہی شر و فساد اور ظلم و ستم کی خاطر، بلکہ اس سفر کا میرا مقصد یہ ہے کہ امت پیغمبرؐ کی اصلاح کروں، لوگوں کو اچھائی کی دعوت دوں اور برائی سے روکوں، میں اپنے جد رسول خدا اور بابا علی مرتضیٰ کی سنت و سیرت کو زندہ کرنا چاہتا ہوں جس کسی نے اس حقیقت کو قبول کرتے ہوئے میری پیروی کی تو خدا حق کا زیادہ حقدار ہے۔ اور اگر کسی نے مجھ سے انحراف کیا تو میں صبر و شکیبائی سے اپنی راہ کی طرف بڑھتا رہوں گا۔ یہاں تک کہ خدا ہمارے اور ان لوگوں کے درمیان فیصلہ کرے، کیونکہ وہی بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔

آپ نے باطل سے مقابلہ، امت پیغمبرؐ کی اصلاح، امر بالمعروف، نہی عن المنکر، سیرت نبوی اور سیرت علوی پر عمل

کی ضرورت کو واضح کیا اور اپنی شرعی ذمہ داری کو نبھانے کے لیے سرو تن کی بازی لگا دی اور دوسرے حق پرستوں کو بھی ان کی ذمہ داریوں کی طرف متوجہ کرتے ہوئے نصیحت فرمائی اور اپنے اس اقدام سے ثابت کر دیا کہ یہ امور اتنے اہم ہیں جن کے لیے اپنی اور اپنے اعزا، اقربا اور اصحاب کی قربانی دی جا سکتی ہے۔ آپ نے اپنے عمل سے واضح کیا کہ میں بھوک پیاس، غریب الوطنی، جگر پاروں کی شہادت، بی بیوں کی اسیری اور دربدری یہ سب کچھ برداشت کر سکتا ہوں لیکن ایک بے دین، فاسق و فاجر کے ہاتھوں میں دین کو کھلونا بنتے نہیں دیکھ سکتا۔ آپ نے الٰہی اصولوں کی پاسداری اور اخلاقی قدروں کی حفاظت کے لیے اپنے کو راہِ خدا میں قربان کر کے ایک مکتب کی بنیاد فرمائی جس کے نتیجہ میں دنیا والوں کی فکری سطح بلند ہو گئی اور فتح و شکست اور ہار جیت کے پیمانے اور معیار تبدیل ہو گئے۔

اگرچہ دنیا میں مظلوموں کی تعداد کم نہیں ہے اور نہ جانے روز کتنے بے گناہ قتل کیے جاتے ہیں لیکن کربلا کے میدان میں ہونے والے مظالم کا قلبِ انسانیت پر کچھ اور ہی اثر ہوا، کیونکہ آپ نے محض اصولوں کی پاسداری کی خاطر یہ ظلم و ستم برداشت کیے تھے اور مصائب و آلام کے ہجوم کے باوجود اپنے پائے استقلال میں لغزش نہیں آنے دی اور اپنی شہادت کے ذریعہ راہِ حق پر چلنے والوں کے جذبوں کو استحکام بخشا، ان کے حوصلوں کو سمت دے دی اور اپنے الٰہی موقف پر جمے رہنے اور جان سے گزر جانے سے انسانی اور اخلاقی قدروں کی تعمیر کی اور بشریت کو منزلِ عمل میں ایک مکمل ضابطۂ حیات عطا کیا۔

چودہ صدیاں گزر جانے کے بعد بھی ہر سال محرم میں مراسمِ عزا کا اہتمام اپنے زمانہ میں حق اور حق والوں کے مکتب سے وابستگی اور باطل سے نفرت و بیزاری کا اعلان ہے۔ مکتبِ عاشورا سے ہماری وابستگی خود ہماری اپنی شناخت کا ذریعہ ہے اور اس بات کا اظہار ہے کہ ہم ایک لمحے کے لیے بھی حق کے ساتھ کھلواڑ کو برداشت نہیں کر سکتے چاہے اس راہ میں ہمیں کربلا والوں کی طرح مصائب و آلام کیوں نہ برداشت کرنا پڑیں۔ محرم کا مہینہ حق کی حمایت اور اس کے لیے سب کچھ قربان کرنے کے لیے خدا سے عہد و میثاق کی تجدید کا مہینہ ہے اور اس عہد پر عمل ہی انسان کو فوزِ عظیم عطا کرتا ہے۔

خدایا! ہم لوگوں کو اپنے اس سالانہ عہد و میثاق کو نبھانے اور اس پر ہمیشہ کاربند رہنے کی توفیق عطا فرما۔ آمین۔

بے شمار نعمتیں

جناب شیخ علی مشکینی

ولا تصعر خدك للناس ولا تمش فی الارض مرحا ان الله لا یحب
کل مختال فخور واقصد فی مشیك واغضض من صوتك ان انکر الاصوات
لصوت الحمیر [1]

"لوگوں سے بے اعتنائی برتتے ہوئے روگردانی اختیار مت کرو، یا زمین پر بہت زیادہ خوش ہو کر راستہ مت چلو کیونکہ خدا مغرور و متکبر انسان کو دوست نہیں رکھتا۔

راستہ چلنے میں اعتدال اور میانہ روی اختیار کرو۔ اپنی آواز بلند نہ کرو کیونکہ بدترین آواز گدھے کی آواز ہے۔"

میانہ روی :

حضرت لقمان نے اپنے فرزند کو جو دس نصیحتیں کی تھیں، مذکورہ آیت ان میں سے چند نصیحتوں کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ "ولا تمش فی الارض" آیت کے اس ٹکڑے کا لفظی معنی یہ ہوگا

---

[1] لقمان / ۱۸-۱۹۔

کہ: "روئے زمین پر بہت زیادہ خوشی و مسرت کے عالم میں راستہ مت چلو"۔ لیکن کیا اس حال میں راستہ چلنا شرعاً منع ہے؟

انسان کے لیے ایسے لمحات اکثر و بیشتر پیش آتے ہی رہتے ہیں جب وہ کوئی مسرت بخش خبر سن کر اتنا زیادہ خوش ہو جاتا ہے جس کی کوئی انتہا نہیں ہوتی۔ تجارت میں دلخواہ منافع حاصل ہوتا ہے یا کوئی مسافر اچانک اپنے وطن واپس آجاتا ہے یا اپنے کسی عزیز کی کامیابی کی خبر ملتی ہے تو ایسے مواقع پر غیر معمولی خوشی و مسرت کا حصول فطری امر ہے تو کیا ایسی حالت میں راستہ چلنا منع ہے؟

یا یہ کہ اس سے مراد وہ غیر فطری خوشی ہے جو نعوذ باللہ کسی فعل حرام کے ارتکاب اور گناہ سے حاصل ہوتی ہے؟ بظاہر ان دونوں میں سے کوئی بھی معنی مراد نہیں ہے بلکہ احتمال ہے کہ یہاں "مشی" سے مراد روش اور طرز عمل ہو، نہ کہ صرف راستہ چلنا اور "مرح" سے جو عربی کے تین دوسرے لفظ "اشر، فرح، بطر" کے ہم معنی ہے، اس سے مراد معین شدہ حد سے تجاوز کرنا ہو۔

بنابریں آیت کا معنی یہ ہوگا کہ انسان اپنی زندگی کے معمولات اور راہ و روش میں اسلام کی جانب سے مقرر کی گئی حدوں سے تجاوز نہ کرے اور آمدنی و اخراجات کے لحاظ سے اپنی زندگی کا لائحۂ عمل اسلامی اصول و قوانین کے مطابق تیار کرے۔ بعد کی آیتوں میں اس مفہوم کو مزید واضح کیا گیا ہے۔

حسابِ زندگی:

ہمیں اپنی زندگی میں ہمیشہ پوری توجہ کے ساتھ یہ حساب کرتے رہنا چاہیے کہ کہیں ہم حد اعتدال سے آگے تو نہیں بڑھ گئے ہیں؟ کیونکہ انسان بعض اوقات زندگی کو زرق برق بنانے میں حدِ اعتدال سے تجاوز کر کے اسراف تبذیر کا شکار ہو جاتا ہے جس کے متعلق خداوند عالم کا ارشاد ہے کہ "انّ المبذّرین کانوا اخوان الشیاطین۔" اسراف کرنے والے شیطان کے بھائی ہیں۔

البتہ چونکہ ہم لوگ اس قسم کی زندگی کے عادی ہو چکے ہیں، لہٰذا ممکن ہے اس کی طرف واقعاً متوجہ نہ ہو سکیں، خصوصاً یہ کہ اگر ہم ایسے ماحول میں زندگی بسر کر رہے ہوں جہاں دوسرے افراد کا طرزِ زندگی اور اس کا معیار بھی ہمارے ہی جیسا ہو لیکن اگر ہم غریبوں کی زندگی اور ان کے رہن سہن

"اے بندۂ خدا، تم کہتے ہو کہ چونکہ میں کھانا کھاتا ہوں لہٰذا رسالت و نمائندگی کی صلاحیت نہیں رکھتا، تو یہ جان لو کہ یہ خدا کا کام ہے اور اس دنیا میں اسی کی مرضی چلتی ہے اور اسی کا حکم جاری ہوتا ہے اور وہ پسندیدہ صفات کا مالک ہے۔ تمہیں یا کسی اور کو اس پر اعتراض کا حق نہیں ہے۔"

اس کے بعد آپ نے ابن امیہ کے ایک ایک اعتراض کا تجزیہ فرما کر انتہائی متانت و سنجیدگی سے جواب دیا اور فرمایا:

"تم نے جو مجھ پر جادو کا الزام لگایا ہے تو میں تو تمہارے درمیان چالیس سال تک رہا اور تم نے سالم عقل کے ساتھ مجھے آزمایا اور مجھ سے نا روا، مکر و دروغ باتیں نہیں دیکھیں اور نہ ہی جھوٹ، خیانت اور اشتباہ و خطا کا مشاہدہ کیا۔ کیونکر ممکن ہے کہ اتنی مدت کوئی شخص تمہارے بیچ پاک اسی سے زندگی گزارے اور تائید الٰہی کے بجائے خود اپنی قوت و طاقت پر بھروسہ کرے۔" (انبیاء علیہم السلام کی روش تبلیغ سے دلچسپی رکھنے والوں کو اس مناظرہ میں دقت اور تامل سے کام لینا چاہیے۔)

آپ توجہ فرمائیں کہ اس بیہودگی کے مقابلہ میں نہ صرف پیغمبر اسلام نے اس کی بات نہیں کاٹی اور اسے اپنی بات کہنے دی، بلکہ اس کی الٹی سیدھی باتوں کو انتہائی متانت سے سنا اور تین مرتبہ پوچھا کہ اور تو کچھ نہیں کہنا ہے۔

ب:— ایک زندیق امام صادق علیہ السلام کی خدمت میں آکر اس طرح اپنے دل کی باتیں بیان کرتا ہے۔

زندیق: "یہ لوگ جس خدا کو نہیں دیکھ پاتے اس کی عبادت کیونکر کرتے ہیں؟"

امام: دل اور عقل انوار ایمان اور اپنی بیداری و فراست کے ذریعہ خدا کو اسی طرح دیکھتے ہیں جس طرح آنکھیں دیکھتی ہیں۔ عقل و دل کی آنکھوں سے خدا کا مشاہدہ اور کائنات کے اجزا کے درمیان پائے جانے والے بہترین نظم اور حسن ترتیب کے ذریعہ وجود خدا کا اثبات اور الٰہی پیغمبروں کے ذریعہ

ابن امیہ کا نام عبداللہ تھا۔ احتجاج طبرسی طبع نجف، ص۱۳۔

وجودِ خدا پر پیش کی جانے والی مستحکم دلیلیں اور محکم آیتیں انھیں ان ظاہری آنکھوں کے ذریعہ مشاہدہ سے بے نیاز کردیتی ہیں اور وہ ان سب چیزوں کے ہوتے ہوئے خدا کو ان ظاہری آنکھوں سے دیکھنے کا تقاضا نہیں کرتے۔

زندیق: کیا خدا لوگوں کے سامنے نہیں آسکتا کہ وہ اسے دیکھیں، پہچانیں اور یقین کامل کے ساتھ اس کی عبادت کریں؟

امامؑ: امر محال کے بارے میں سوال کا کوئی جواب نہیں ہے۔[۱]

زندیق: آپ اس کے رسولوں کو کس دلیل سے ثابت کرتے ہیں؟

امامؑ: جب ہم نے یہ ثابت کردیا کہ خود ہم سے اور ہر چیز سے بزرگ و برتر پیدا کرنے والا ہے اور وہ حکیم ہے اور دکھائی نہیں دیتا اور بندوں کے ساتھ اس کی رفت و آمد اور گفتگو ممکن نہیں ہے تو ثابت ہوتا ہے کہ اس نے اپنے بندوں کو ان کے مصالح و منافع کی طرف راہنمائی کے لیے کچھ افراد بھیجے ہیں تاکہ اس کے بندے ان مصالح و منافع سے محروم نہ ہوں۔ وہ افراد خلقت میں بندوں جیسے ہیں، ان کے ساتھ رہتے بستے ہیں لیکن خدا کی طرف سے معجزوں کے ذریعہ ان کی تائید عمل میں آتی ہے۔....

زندیق: خدا نے اشیاء کو کس چیز سے پیدا کیا؟

امامؑ: لاشئی (کسی چیز سے نہیں) سے۔

زندیق: کوئی چیز لاشئی سے کیسے وجود پذیر ہوسکتی ہے؟

امامؑ: اشیاء یا شئی سے بنیں گی یا لاشئی سے۔ اگر شئی سے بنیں گی تو خدا کے ساتھ اس شئے کو بھی ہونا چاہیے اور اسی کی طرح اسے بھی قدیم ہونا چاہیے اور قدیم چیز حادث، فانی اور متغیر نہیں ہوتی۔ اس کے علاوہ اگر وہ اصلی شئی ایک چیز ہوتی ہے جیسے ایک جوہر، ایک رنگ تو متعدد قسم کی رنگ برنگی اشیاء کہاں سے پیدا ہوئیں؟ اگر اس پہلے والے مادہ میں حیات تھی تو پھر یہ موت کہاں سے آگئی اور اگر موت

۱۔ واقعاً یہ جواب انتہائی خوبصورت، مختصر، مفید اور اچھا ہے کیونکہ لوگوں کے سامنے خدا کا ظاہر ہونا اس بات پر موقوف ہے کہ خدا جسم ہو جسے لوگ دیکھ سکیں اور اس کا جسم ہونا محال ہے اس لئے کہ جسم حادث ہے اور حادث علت کا محتاج ہوتا ہے۔ یعنی ایک ایسی قدرت ضروری ہے جو جسم کو مادہ اور خاص شکل میں تشکیل دے۔ پس تمہارا سوال ایک محال چیز کے وجود پذیر ہونے کے بارے میں ہے جو ناممکن اور باطل ہے، اس لئے جواب دینے کی ضرورت نہیں ہے۔

حتی تو یہ حیات کہاں سے آئی اور یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ دونوں ازل سے تھے کیونکہ ازلی حیات والا کبھی بھی موت کا شکار نہیں ہو سکتا اور ازلی موت کسی قسم کی قدرت و بقا نہیں رکھتی۔

زندیق: تو یہ کیوں کہا جاتا ہے کہ اشیاء ازلی ہیں؟

امام: یہ ان لوگوں کا کلام ہے جو مدبر اشیاء خدا کا انکار کرتے ہیں، انبیاءؑ کو جھٹلاتے ہیں اور خود ساختہ دین کی پیروی کرتے ہیں۔ کائنات میں حرکت اور تغییر ایک صانع اور مدبر کے وجود پر دلالت کرتی ہے۔

زندیق: اس کا مطلب یہ ہوا کہ دنیا کا پیدا کرنے والا دنیا کے وجود میں لانے سے پہلے اس کے بارے میں معلومات رکھتا تھا۔

امام: وہ ہمیشہ جانتا (دائم العلم) ہے۔ اس نے معلوم کو وجود بخشا ہے[1]۔

زندیق: خدا کے اجزاء مختلف ہیں یا ان میں ہم آہنگی پائی جاتی ہے؟

امام: اس کے جزو نہیں ہے جو مختلف یا ہم آہنگ ہو۔

زندیق: تو اس کی وحدانیت و یکتائی کیونکر ہے؟

امام: اس کی ذات واحد و یکتا ہے۔ وہ دوسرے واحد کی طرح نہیں ہے جو اجزا سے مرکب ہوں اور شمار کیے جائیں۔

زندیق: وہ مخلوقات کا محتاج نہیں تھا، مجبور و مضطر نہیں تھا اور بیہودہ کام بھی نہیں کرتا ہے پھر اس نے انھیں کیوں پیدا کیا؟

امام: اس نے اپنی حکمت کے اظہار اور اپنے علم و تدبیر کو نافذ کرنے کے لیے مخلوقات کو پیدا کیا ہے۔

زندیق: اس نے دنیا کو ہی ثواب و عقاب کی جگہ کیوں نہیں بنایا اور آخرت کو الگ سے خلق فرمایا؟

امام: یہ دنیا امتحان و آزمائش کا مقام ہے، ثواب حاصل کرنے کی جگہ اور آفات و شہوات سے پُر ہے، لہٰذا اسے دار جزا نہیں بنایا جاسکتا۔

زندیق: کیا اسے حکمت کہا جائے گا کہ جس کے دشمن نہ ہوں وہ ایک دشمن ابلیس نام کا اپنے لیے پیدا کرکے اپنے بندوں پر مسلط کر دے جو اس کی نافرمانی کا حکم دے اور اس کی اطاعت سے روکے

---

[1] ہمیشہ جانتا ہے، یہ مرکب صفت ہے نہ یہ کہ وہ ہمیشہ عالم کے لیے زمانی قید ہے۔

اور خود اس کے بقول حیلہ اور بہانہ سے دل میں بیٹھ کر وسوسہ کرے تاکہ لوگ خدا کا انکار کر کے دوسرا معبود منتخب کرلیں؟

امامؑ: جس دشمن کا تم ذکر کر رہے ہو اس کی دوستی اور دشمنی اسے فائدہ یا نقصان نہیں پہنچاتی ہے۔ اس کی سلطنت و اقتدار سے کچھ کم نہیں کرتی۔ اس دشمن سے بچنا چاہیے جس میں نفع یا نقصان پہنچانے کی قوت ہو۔ ابلیس اس کا بندہ ہے جسے اس نے اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا تھا۔ اس نے ایک عرصہ تک عبادت کی اور جب آدم علیہ السلام کے سجدہ کے سلسلہ میں امتحان لیا گیا تو اس نے حسد سے کام لیا اور سجدہ نہیں کیا۔ خدا نے بھی اسے ملعون قرار دے کر اپنے ملائکہ کی صف سے خارج کر دیا اور زمین پر اتار دیا۔ وہ اولادِ آدم کا دشمن ہو گیا لیکن وسوسہ کے علاوہ اور کچھ نہیں کر سکتا۔ وہ ان تمام حالات میں بھی خدا کی ربوبیت کا قائل ہے۔

زندیق: کیا غیر خدا کے لیے سجدہ کرنا جائز ہے؟

امامؑ: نہیں۔

زندیق: تو پھر خدا نے فرشتوں کو آدمؑ کے لیے سجدہ کرنے کا کیونکر حکم دیا تھا؟

امامؑ: جو حکمِ خدا پر سجدہ کرتا ہے وہ درحقیقت خدا کو سجدہ کرتا ہے۔

زندیق: کہانت اور غیب گوئی کیسے وجود میں آئی اور کچھ لوگ آئندہ کی باتوں کو کس طرح جان لیتے ہیں؟

امامؑ: یہ غیب گوئی جاہلیت اور دو پیغمبروں کے مبعوث ہونے کے درمیانی زمانہ میں تھی۔ لوگ نامعلوم باتوں کو جاننے کے لیے کاہن سے رجوع کرتے تھے اور وہ انھیں بتاتا تھا اور کہانت و غیب گوئی کا سرچشمہ مختلف چیزیں ہیں، مثلاً فراستِ چشم، ذکاوتِ دل اور وسوسۂ نفس وغیرہ۔

شیطان زمین میں رونما ہونے والے حوادث کو جانتا ہے اور وہ اس کی خبر کاہن کے دل میں ڈال دیتا ہے لیکن آسمانی باتوں کی اسے خبر نہیں ہے تاکہ وحی مشکوک نہ ہو جائے اور لوگ گمراہی میں نہ پڑ جائیں۔ ماضی میں کبھی کبھی شیطان آسمانی خبریں پا جاتا تھا اور اسے چھپا کر کاہن کو بتا دیتا تھا اور وہ بات کم یا زیادہ ہو جاتی تھی اور حق و باطل میں اختلاط کا سبب ہوتی تھی، لیکن جس زمانہ سے شیاطین کا آسمانی خبروں کا سننا ممنوع ہو گیا۔ آسمانی کہانت و غیب گوئی کا سلسلہ بھی منقطع ہو گیا۔

اب بھی کبھی شیاطین کاہن کو چوری، قتل یا کسی کی گمشدگی کی اطلاع دیتے ہیں۔

زندیق: شیاطین آسمان پر کیونکر جاتے تھے جبکہ وہ جسم والے اور سنگین ہیں؟

امام: وہ رقیق مخلوق ہیں۔ ان کی خوراک نسیم ہے۔

اس کے بعد زندیق سحر و جادو اور اس کی قسموں کے بارے میں پوچھتا ہے۔ ہاروت و ماروت، لوگوں کے مختلف طبقات، اس میں مساوی و برابر اور بہ اعتبار تقویٰ ممتاز ہونے کے بارے میں پوچھتا ہے۔ سوال کرتا ہے کہ خدا نے لوگوں کو مطیع و فرمانبردار کیوں نہیں پیدا کیا ہے۔ وہ جبر و تفویض کے بارے میں متعدد سوالات کرتا ہے، لوگوں کے فقیر اور غنی ہونے کے بارے میں جانکاری چاہتا ہے، بہت سے طبی مسائل کے بارے میں استفسار کرتا ہے، نومولود کے ختنہ کی علت معلوم کرتا ہے، بعض لوگوں کی دعائیں قبول نہ ہونے کی وجہ دریافت کرتا ہے۔ وہ سوال کرتا ہے کہ آسمان اور زمین کے درمیان رابطہ کیوں نہیں ہے اور رفت و آمد کیوں نہیں ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر ہر صدی میں ایک مردہ زندہ ہو جائے اور ہم سے وہاں کی خبروں کو نقل کرے تو ہمارا شک رفع ہو سکتا ہے اور ہم یقین کامل کے ساتھ خدا کی عبادت و پرستش کر سکتے ہیں اس نے تناسخ کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ مذہب مانی، مذہب ثنویہ، مذہب مجوس اور ان کی شریعتوں کے بارے میں سوال کیا، علم نجوم و ہیئت، رسول کی حکم پر فضیلت، سعادت و شقاوت کی تعریف سے متعلق سوالات کیے۔ اس نے کہا کہ جب چراغ بجھ جاتا ہے تو اس کا نور دوبارہ واپس نہیں آتا تو بدن سے نکلنے والی روح بدن میں کیونکر واپس ہوگی۔ وہ پوچھتا ہے کہ مرنے کے وقت سے لے کر قیامت تک انسانی روح کہاں رہتی ہے اور روح اور ہوا میں کیا فرق ہے، زندگی دوبارہ کس طرح ملتی ہے اور محشر میں لوگ کفن کے ساتھ محشور ہوں گے یا برہنہ، وہ معلوم کرتا ہے میزان پر عمل کیونکر تلے گا اور کیا جہنم کی آگ کافی نہیں تھی جو خدا نے اس میں سانپ بچھو کا اضافہ کر دیا اور یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ جنت والے جب کسی درخت سے ایک پھل توڑ لیں گے تو اس کی جگہ دوسرا پھل لگ جائے گا۔ وہ سوال کرتا جاتا ہے اور جواب سنتا جاتا ہے۔ وہ اتنا سوال کرتا ہے کہ لکھنے والا، پڑھنے والا اور مطالعہ کرنے والا، ہر ایک اس کے سوال سے تھک جائے، لیکن امام علیہ السلام انتہائی بردباری اور سنجیدگی سے سوالات سنتے ہیں اور اس کا جواب دیتے ہیں۔

اس طرح کے اور بہت سے مناظرے ائمہ علیہم السلام اور کفار و مشرکین اور مخالفین کے درمیان ہوئے

لیکن ائمۂ طاہرینؑ سوالات کی کثرت، ان کی تکرار اور کجی سے تھکتے نہیں تھے۔

دوم:۔ مبلغ کے لیے دوسری لازمی شرط زبان کی نرمی اور ہر طرح کی توہین اور استخفاف سے دوری اختیار کرنا ہے۔ کوئی مبلغ یہ دعویٰ کیسے کر سکتا ہے کہ وہ خدا کے لیے اپنے دینی و شرعی فریضہ کی ادائیگی کے لیے دعوت کر رہا ہے اور خدا کے ان بندوں کے ساتھ خشونت سے، سخت کلامی سے پیش آ رہا ہے، جن کے پاس وہ ہدایت و رہنمائی کے لیے آیا ہے؟ اور جن کی توہین کر رہا ہے ان سے اس بات کی توقع کیسے رکھی جا سکتی ہے کہ وہ اس کی بات مان لیں گے؟ حتیٰ اگر کوئی اپنے مخاطب سے کہے: "تم میری بات نہیں سمجھ پا رہے ہو، ابھی اور تعلیم حاصل کرو۔" یہ خود ایک طرح اس کو سبک کرنا ہے۔ یہ جملہ متکلم کے اپنی بات نہ سمجھا پانے اور استدلال کو صحیح اور عام فہم بنانے میں عاجزی پر دلالت کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے تکبر اور خود بینی پر دلالت کرتا ہے، اور مخاطب کے حق میں بے ادبی اور اس کی شخصیت سے کھیلنا ہے۔ خداوند عالم شیطان، نمرود اور فرعون سے بحث و استدلال میں ان سے یہ نہیں کہتا کہ تم سمجھتے نہیں ہو۔ پیغمبر اسلامؐ اور ائمۂ طاہرینؑ علیہم السلام کے کسی مناظرہ میں یہ نہیں ملتا کہ آپؐ نے ایک دفعہ بھی ابوجہل جیسے لوگوں سے کہا ہو کہ "تم نہیں سمجھتے ہو"۔ "تم نہیں سمجھتے ہو" کا کیا جواب یہ نہیں ہوگا کہ تم ہماری سمجھ کے مطابق بیان و استدلال کیوں نہیں لاتے؟ جب نمرود نے جناب ابراہیمؑ سے کہا: اگر تمہارا خدا زندہ کرتا اور مارتا ہے تو میں بھی اسی طرح مارتا اور جلاتا ہوں: اس نے حکم دیا۔ دو قیدیوں کو لایا گیا۔ ایک کو قتل اور دوسرے کو آزاد کر دیا گیا۔ اگر ہم آپ ہوتے تو کہتے کہ تم آزاد کرنے اور زندہ کرنے کے فرق کو کیوں نہیں سمجھتے۔ زندہ کرنے کا مطلب بے جان جسم میں حیات کو داخل کرنا ہے، قید خانہ سے رہائی دینا نہیں ہے، لیکن جناب ابراہیمؑ نے یہ بات نہیں کہی بلکہ فرمایا: "خدا سورج کو مشرق سے طلوع کرتا ہے، تم اگر کر سکتے ہو تو اسے مغرب سے ظاہر کردو۔" نمرود یہ بات سمجھ گیا اور چپ ہو گیا۔

مسلمانوں میں علماء اور غیر علماء بہت سے ایسے افراد ملتے ہیں جنھیں خدا نے روشن دلی اور عرفان عنایت کیا ہے۔ جب وہ کور دل افراد سے گفتگو، مناظرہ اور مجادلہ کرتے ہیں، تو وہ کبھی یہ نہیں کہتے کہ "تم سمجھتے نہیں ہو" کیونکہ ان کے عارف ہونے کا مطلب یہ ہے کہ:

۱۔ عارف جانتا ہے کہ اسے اس طرح کی عظیم نعمت کی عطا کے مقابلہ میں شکر ادا کرنا چاہیے، نہ یہ کہ وہ دوسروں کی محرومی پر انھیں سرزنش کرے۔

۲۔ عارف کو چاہیے کہ غافلوں اور بے خبروں کے ساتھ ہمدردی اور مہربانی سے پیش آئے، انھیں ملامت اور سرزنش نہ کرے۔

۳۔ عارف کو معلوم ہے کہ اس کا عرفان خود اس کے لیے حجت ہے، دوسروں کے لیے نہیں، جو خود اس مرحلہ پر نہیں پہنچے ہیں وہ یا تو معذور جاہل ہیں یا جہالت کے بھنور میں بلا عذر پھنسے ہیں۔ ہر صورت میں ان پر وہ چیز تھوپنا جس کا انھیں علم نہیں ہے "تکلیف مالا یطاق" ہے۔

۴۔ عارف کی ذمہ داریاں خدا کے حضور غیر عارف کے مقابلہ میں بہت زیادہ سنگین ہیں، کیونکہ خدا ہر شخص سے اس کی فہم و دانش کے مطابق حساب کتاب کرتا ہے۔

۵۔ اگر مخاطب سے کہہ دیا جائے کہ "تم نہیں سمجھتے" تو گویا اسلام سے متنفر کر کے اسے بھگا دیا۔

۶۔ ائمۂ طاہرین علیہم السلام کو بھی اس طرح کے غافل اور بے خبر افراد سے سابقہ تھا، لیکن انھوں نے کبھی بھی نادانی و جہالت کی نسبت ان کی طرف نہیں دی جبکہ ائمہ اور غافل مخاطبین کے درمیان فاصلہ عارفین اور ان کے مخاطبین کے درمیان فاصلہ سے کہیں زیادہ تھا۔

۷۔ عارف کے عرفان کی سطح کی بلندی اور دوسروں کی غفلت کی پستی کے سبب اس کا دل تنگ ہو جائے تو رہبرانِ دین کی طرح کنویں میں منہ ڈال کر رازہائے دل اس کے حوالے کرتا ہے۔



شبیرؑ کا پیغام زمانہ کے لیے ہے

جناب ڈاکٹر دھرمیندر ناتھ

جناب دھرمیندر ناتھ صاحب پروفیسر پولیٹیکل سائنس، دہلی یونیورسٹی، معروف شاعر جناب گوپی ناتھ امن لکھنوی کے صاحبزادہ ہیں جنھیں مدحتِ رسولؐ و آلِ رسولؐ کی دولت وراثت میں ملی ہے۔ موصوف کو نثر و نظم دونوں پر یکساں دسترس حاصل ہے۔ آپ نے واقعۂ کربلا اور اس کے مضمرات کا نہ صرف گہرائی کے ساتھ مطالعہ کیا ہے بلکہ اس سے حاصل ہونے والے پیغام کو عام کرنے کی حتی الوسع سعی و کوشش بھی کرتے رہے ہیں۔ آپ کے اشعار اور مقالات کا ایک ایک لفظ خاندانِ رسالت سے آپ کے قلبی لگاؤ اور عقیدت کا آئینہ دار ہے، زیرِ نظر مقالہ جس کا بہترین ثبوت ہے۔ (ادارہ)

حسینیت کا پیغام کسی ایک فرقہ یا خطہ کے رہنے والوں کے لیے محدود نہیں ہو سکتا کیونکہ خیر و شر کا تصادم، حق و باطل کا مجادلہ کسی ایک فرقہ، مذہب، خطۂ ارض یا کسی خاص دور تک ہی محدود نہیں ہے۔ حسینؑ حق کے امین ہیں اور یزید باطل کی قوتوں کا سربراہ۔ ایک منارۂ نور ہے تو دوسرا ظلمت کا بادل۔ حسینیت انسانیت کا پیغام ہے تو یزیدیت سرمایۂ شیطنت اور سماج دشمن عناصر کا مظہر۔ یہ خیر و شر کا تصادم ہر دور میں روپ بدل بدل کر سامنے آ رہا ہے۔ جو پیغام فاتحِ قلوب اور بقائے انسانیت کا ضامن ہو تو وہ ہر فرد و قوم، خطہ و ملک کے لیے ضروری ہے۔ جیسے تابشِ انجم کسی ایک فرد کے لیے مخصوص نہیں، ضیا پاشیِ ماہِ کامل کسی ایک علاقہ تک محدود نہیں، یا نور افشانیِ آفتاب کسی قصرِ سلطانی میں محصور نہیں

اسی طرح حسینیت پر بھی کسی ایک فرقہ کی اجارہ داری نہیں، جو اہلِ دل ہیں وہ اس سے فیضیاب ہوتے رہتے ہیں۔ تمام عالم اس سے روشنی پاتا ہے اور پاتا رہے گا۔ حسینیت تو انسانی ذہن کو بالیدگی، شعور کو پختگی اور یقین کو استحکام بخشتی ہے۔ اس سے ذہنی افق وسیع ہوتا ہے، فکری اساس کو رفعت ملتی ہے اور بصیرت و فکر متحرک ہوتے ہیں۔

ہر معاشرہ، ہر دور کے معمولات، تفاعلات، طور، پابندیاں، روایات، رسوم اور رواج الگ ہوتے ہیں، جن کے تار و پود سے فکر و نظر متعین شکل میں یافت ہو جاتی ہے اور زندگی ایک خاص ہیئت و نہج اختیار کر لیتی ہے۔ لیکن کچھ اقدار ابدی و دائمی ہیں جن کی ودیعت ایک ایسی قوت کے ذریعہ ہوتی ہے جو کُل نظامِ کائنات پر قدرت رکھتی ہے۔ باطل کے بہلانے پھسلانے کے باوجود انسان کو اس کے اصل مرجع کی طرف رخ کراتی ہیں۔ یہی احساس ایمان کی بنا ہوتا ہے۔ اس لیے جو ان قدروں کی امانت کا تحفظ کرے، ان کی اشاعت و تبلیغ کرے اور ان پر اپنا سب کچھ نثار کرنے میں دریغ نہ کرے، وہ ہستی کسی ایک دور یا فرقہ کا اثاثہ نہیں، بلکہ تمام عالم کے لیے قابلِ تعظیم ہستی بن جاتی ہے اور ہر ایک فرد و قوم کے لیے ہمیشہ مشعلِ ہدایت بنی رہتی ہے جو بیداریٔ ذہنِ انسانی کی ہر دور میں ضامن ہے۔ بقولِ جوش ملیح آبادی ؎

انسان کو بیدار تو ہو لینے دو ہر قوم پکارے گی ہمارے ہیں حسینؑ

جناب مہدی نظمی مرحوم نے اپنے ایک شعر میں حسینؑ کے نام کا حرفی تجزیہ کیا ہے۔ حائے حُطّی سے "حمد" س سے "سجدہ" یائے معروف سے "یقین" اور نون سے "نماز"۔ ذرا خیال فرمائیے، حسینؑ کی حیات ان تمام خوبیوں کی حامل ہے کہ نہیں۔ زبان پر ہمیشہ حمدِ باریٔ تعالیٰ رہنی چاہیے۔ یہ نہیں کہ ذرا دشواریاں پیش آئیں تو خالقِ تقدیر سے شکوہ کرنے لگے۔ حسینؑ کو کیا کیا مصائب پیش نہ آئے۔ پیاسے بچوں کی تڑپ، اپنوں کی شہادت۔ بسترِ زخم کھا کر بھی حسینؑ ربِ کریم سے شکایت نہیں کرتے۔ صبر و رضا کے پیکر حسینؑ جن کی زبانِ مبارک رسولِ اکرمؐ کے لعابِ دہن سے تر ہوئی، وہ سوائے حمد و ثنا کے اور کیا کہیں گے۔ حسینؑ نے بندگی کا ایک معیار قائم کیا ہے۔ حسینؑ کس کے فرزند ہیں؟ مولائے کائنات، مولائے مشکل کشا، امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام کے، جن کے سرِ مبارک پر ملعون قاتل نے مسجد میں عین نماز میں جب وار کیا تو مولا کی زبان سے بے ساختہ نکلا:

"ربِ کعبہ کی قسم، میں کامیاب ہوا۔"

یعنی ربِ کعبہ زندگی بھر ان کے پیشِ نظر رہا، تبھی تو امتحانِ حیات میں وہ کامیاب ہے۔ اس مولودِ حرم

کے فرزند یعنی حسینؑ نے سجدہ کو کس شان سے ادا کیا۔ کربلا میں آخری وقت بھی تہہ خنجر امام عالی مقام نے سجدہ ادا کیا۔ یہ شان تغیری ہے۔ بقول والد محترم قبلہ اتق لکھنوی

حسینی شان کے سجدے ہیں سجدے میری نظروں میں
جبیں فرسائیوں کا نام سجدہ ہو نہیں سکتا

حسینؑ پیکر یقین و ایماں ہیں۔ آپ کا عقیدہ راسخ تھا۔ یقین کبھی متزلزل نہیں ہوا۔ گھر بار سب وار دیا۔ لیکن دین کی عظمت پر آنچ نہ آنے دی۔ ایمان کی حرمت کی حفاظت کے لیے سر دے دیا لیکن بیعت نہیں کی۔ ان کا ہر عمل قرآن پاک کی تفسیر ہے۔ بیعت ایک جبری عمل نہیں، اختیاری فعل ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "تمہارا دین تمہارے لیے، ہمارا دین ہمارے لیے ہے۔" یعنی مذہب میں زور زبردستی کا دخل نہیں ہونا چاہیے۔ یزید نے احکام قرآنی کو نہیں مانا۔ بیعت لینے کے لیے کیا کیا مظالم نہیں کیے۔ لیکن وصی دین محمدؐ نے ظلم کے آگے سر نہیں جھکایا۔ حسینؑ دین پناہ تھے جو خود بنائے لا الٰہ بن گئے۔

شاہ است حسینؑ، بادشاہ است حسینؑ
دین است حسینؑ، دین پناہ است حسینؑ
سر داد، نہ داد دست در دست یزیدؔ
حقا کہ بنائے لا الٰہ است حسینؑ

نماز بھی حسینؑ کی زندگی کا جزو لاینفک ہے۔ کربلا میں تیروں کی بوچھار میں بھی صف بندی ہوتی اللہ کے حضور میں نواسۂ نبیؐ سر جھکائے ہوئے ہیں۔ اشقیا اپنی حرکات شنیع سے باز نہیں آتے، لیکن حسینؑ ثابت قدم ہیں۔ آخر فرزند کس کے ہیں۔ مولائے کائنات حضرت علیؑ نے جب میدان جنگ میں وقت نماز بارگاہ الٰہی میں سر جھکانے کا ارادہ کیا تو کسی نے پوچھا "حضور، جنگ کے وقت نماز؟" جواب فرمایا "تو ہم یہ جنگ کس لیے لڑ رہے ہیں؟" جس کو وراثت میں یہ دولت ملی ہو چاہے زمانہ امن ہو یا وقت جنگ، وہ نماز کی عظمت کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ حسینؑ نے میدان کربلا میں بھی اس روایت کو زندہ رکھا۔

ہندی میں ایک کہاوت ہے "جیسا نام ویسے تھا گن" یعنی جیسا نام ویسے اوصاف۔ حسینؑ کی ذات پاک میں ان کے نام کی تمام صفات بدرجۂ اتم موجود تھیں۔ تمام صفات پاک، یقین محکم، سجدہ اور عبادت ایسے اجزاء ہیں جو اعلیٰ اقدار کی پاسداری اور انسانیت کی آبیاری کرتے ہیں۔ حسینؑ ان اقدار کو جیے اس لیے ان کی

کا جائزہ لے کر ایک بار اپنے سے ان کا موازنہ کریں، اس وقت ہم اپنے متعلق صحیح فیصلہ کر سکیں گے۔

اگر ہمارا رہن سہن حدِ اعتدال سے آگے بڑھ جائے گا تو ہم خود کو غریبوں سے برتر سمجھنے لگیں گے اور ہمارے اندر احساسِ برتری جاگ اٹھے گا۔ آیت شریفہ اسی نکتہ کی طرف توجہ دلانا چاہتی ہے کہ خداوند عالم مغرور و متکبر اور احساسِ برتری رکھنے والے انسانوں کو دوست نہیں رکھتا۔ اسی لئے لقمان نے اپنے فرزند کو نصیحت کی ہے کہ اپنی زندگی میں ہمیشہ اعتدال و میانہ روی کا خیال رکھنا تاکہ کبھی اس حالت کو نہ پہنچو جو خدا کو ناپسند ہے۔

ہر کام میں اعتدال:

میانہ روی ہر کام میں ہونی چاہیے۔ علمائے اخلاق کا بیان ہے کہ: انسان کو اخلاق اور عمل دونوں ہی لحاظ سے اعتدال میں رہنا چاہیے۔ مثلاً سخاوت ایک صفت ہے جو انفاق میں میانہ روی کی حالت کا احاطہ کرتی ہے۔ اگر انسان اس حد سے تجاوز کر جائے تو یا وہ اسراف کا شکار ہو جائے گا اور یا پھر بخل میں مبتلا ہو جائے گا جو سخاوت کا نقطۂ مقابل ہے۔ معصومؑ نے اپنے ایک ساتھی کے سامنے انفاق میں میانہ روی کو مجسم کرنے کی غرض سے ایک دن اپنی مٹھی میں ریت بھر کر اسے اتنی مضبوطی سے بند کر لیا کہ ریت کے دانے اس سے گر نہ سکیں۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا یہ بخل ہے۔ پھر اسے اس طرح سے جھاڑ دیا کہ کوئی ذرہ باقی نہ بچے اور فرمایا یہ اسراف ہے۔ اس کے بعد آپ نے دوبارہ مٹھی میں ریت اٹھا کر اس طرح سے بند کیا کہ کچھ ریت گر گئی اور کچھ مٹھی میں رہ گئی۔ آپ نے فرمایا دیکھو نہ اس قدر سخاوت کرو کہ خود تم بھیک مانگنے پر مجبور ہو جاؤ اور نہ انفاق سے اتنا اجتناب کرو کہ کسی کی مدد کرنے پر تیار نہ ہو۔ بلکہ تمہیں میانہ روی اختیار کرنی چاہیے۔

علمائے اخلاق نے صفت شجاعت کو معتدل اوصاف میں شمار کیا ہے۔ انسان اگر اس حد سے گزر جائے تو یا وہ متہور و بے باک بن جائے گا اور یا ڈرپوک اور بزدل۔ بعض افراد اتنے بے باک ہوتے ہیں کہ خود کو ہر خطرہ میں ڈالنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں اور کچھ لوگ اتنے بزدل ہوتے ہیں کہ وہ چوہے اور بلی سے بھی ڈر جاتے ہیں۔ ظاہر سی بات ہے کہ یہ دونوں حالتیں غیر فطری، لائق مذمت اور ناپسندیدہ ہیں۔ لقمان اپنے فرزند کو اس سلسلہ میں بھی نصیحت کرتے ہیں کہ وہ میانہ روی و اعتدال سے کام لے۔

زندگی اوروں کے لیے خود ایک پیغام بن گئی۔ جیسے جیسے انسانی شعور کا ارتقا ہو رہا ہے، ہر شخص حسینؑ کو اپنے اور قریب محسوس کرنے لگا ہے۔

امام عالی مقامؑ کی تربیت و سیرت سازی میں نانا جان پیغمبر آخرالزماں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، والد عالی مرتبت، امام اولین حضرت علی علیہ السلام اور والدۂ ذی احترام بنت رسولؐ فاطمہ زہراؑ کا اہم کردار تھا۔ جس کو پشت نبیؐ پر بیٹھنے کا شرف حاصل ہوا ہو، اس کی نعمتوں کا اندازہ کون لگا سکتا ہے۔ حسینؑ کو دُنیاوی دولت کی تمنا نہ تھی۔ وہ روحانی دولت سے مالا مال تھے۔ جس کے کان میں رسالت مآبؐ نے اذان و اقامت کہی ہو اور آغوش رسولؐ میں جس کی پرورش و تربیت ہوئی ہو، جس کے والد بزرگوار باب علم علی علیہ السلام ہوں جنھوں نے تخت و تاج کے مقابلہ میں عظمت کردار پر زور دیا ہو اور شہی میں بھی عظمت و شانِ فقیری قائم رکھی ہو، جنھوں نے دس سال میں اسّی معرکوں میں فتح حاصل کرنے کے باوجود جب تلوار رکھ کر قلم اٹھایا تو پچیس سال تک علم و ادب، شعر و سخن کو اعجاز بخشا ہو۔ جو مالکِ ذوالفقار ہوتے ہوئے بھی غاصبانہ سیاست کے مقابلہ میں خانہ نشینی کو ترجیح دیں۔ حسینؑ، جن کی مادرِ مہربان بنتِ رسولؐ ہو، طہارت، عبادت و خدمت ہی جس کی زندگی ہو۔ ایسے خاندان کا چشم و چراغ کیا جارحیت کو پسند کرے گا؟ کیا وہ غلط وسیلوں، غیر اخلاقی طریقوں سے مطلب برآری کرے گا؟ اس گھرانے میں جو تعلیم دی گئی، جو اقدار فکر و نظر کا حصہ رہیں، ان کے آگے آج عالمِ عقیدت سے سرنگوں ہے۔ حسینؑ کے تمام فضائل کا بیان کرنے کی تاب و تواں اور قابلیت کس میں ہے۔ اس خاندان کی فضیلت تو اس سے ہی ظاہر ہے کہ دنیا میں کسی ایک خاندان میں علمی، مذہبی، سماجی قیادت اتنی نسلوں تک قائم نہیں رہی۔ آج بھی دنیا ان کی قیادت کے زیرِ اثر ہے۔ دُنیا کبھی اولادِ علیؑ سے خالی نہیں ہوگی۔ یہ امامت کا سلسلہ کسی اور خاندان کو نصیب نہیں ہوا۔ جبر و استیصال کے ذریعہ بادشاہتیں سلطنتیں کچھ عرصہ تک قائم رہتی ہیں، لیکن اخلاقی قوت اور عوام کے دلوں پر راج کرنے کی قوت اگر نسلاً بعد نسلٍ قائم رہے تو یہ روحانی فضیلت ہے جو ایک کرامت یا ایک معجزہ سے کم نہیں۔

صاف گوئی، ہمت و جرأت، علیؑ کے خاندان کی خاصیتوں میں سے ہیں۔ آج ہم لوگ خاموشی کا تمغہ اختیار کر لیتے ہیں۔ جابر، مطلق العنان بادشاہوں، سربراہوں کے سامنے سر جھکا دیتے ہیں لیکن ذرا ایک بچے کی ہمت ملاحظہ فرمایئے، جو حاکمِ وقت سے کہہ دے:

"میرے نانا کے منبر پر بیٹھنے کا تمہیں کوئی حق نہیں، اتر جاؤ۔"

یہ بے خوفی صرف گھر کی تربیت کا اثر ہے۔

حضرت حسین علیہ السلام بحرِ علوم تھے۔ کوئی بھی دینی یا علمی مسئلہ ہو، لوگ آپ سے رائے طلب کیا کرتے تھے۔ کسی آیت کی تفسیر ہو یا کسی حدیث کی صحت کے متعلق کوئی سوال ہو، امام عالی مقام کی ذات گرامی کی طرف جویانِ علوم رجوع کرتے تھے۔ آپ کی ذات دافعِ اوہام و شکوک تھی۔ کتنے ہی لوگ آپ سے فیضیاب ہوتے رہے۔ یہ علوم صرف ذہن تک ہی محفوظ نہیں تھے، بلکہ حیات کا ہر پہلو علم و ایمان سے منور تھا۔ حسینؑ جو فرماتے تھے لوگوں کے دلوں پر اثر کرتا تھا۔ بقول احسن لکھنوی ؎

فرمودۂ حسینؑ میں قرآں کی شان ہے

شہادتِ حسینؑ بھی کلامِ پاک کی عملی تفسیر ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"خدا کی راہ میں قتل ہونے والوں کو مردہ نہ سمجھو، وہ زندہ ہیں اور ہمارے یہاں سے روزی پاتے ہیں۔"

میدانِ کربلا میں کلامِ ربانی کی جس انداز سے تفسیر ہوئی، اس سے ایمان کے معانی اور واضح ہو گئے۔ حسینؑ نے ایمان کو جِلا دی اور عقائد کو استحکام بخشا۔ اللہ کی راہ میں صبر و رضا کے ساتھ سب کچھ قربان کر دیا۔ کیونکہ ایمان اگر جان حسینؑ تھا تو حسینؑ جانِ ایمان تھے۔

امام حسینؑ کو جنگ پسند نہ تھی۔ جارحیت میں ان کا یقین نہ تھا۔ کئی مواقع ایسے آئے جب لڑائی شروع ہو سکتی تھی مگر امام حسینؑ نے دانشمندی اور حسنِ تدبیر سے امن قائم رکھا۔ یزید نے حاکمِ مدینہ کو پیغام بھجوایا کہ امام حسینؑ پر سختی کر کے بیعت کے لیے مجبور کرو۔ اگر امام انکار کریں تو قتل کر کے سر دمشق بھیج دو۔ امام صلح جو، صلح خو، صلح کوش نے مروان کی بدتمیزی پر اسے ڈانٹا اور بنی ہاشم کے جانباز نوجوانوں کو لڑائی سے باز رکھا۔ نانا کا شہر مدینہ چھوڑ کر حسینؑ مکہ معظمہ چلے گئے۔ حج سے دو دن قبل مکہ سے بھی سفر اختیار کیا، کیونکہ کعبہ کی حرمت برقرار رکھنے اور مسلمانوں کی خوں ریزی روکنے کے لیے آپ کو یہ قدم اٹھانا پڑا۔ مکہ اور مدینہ میں جہاں رسولِ اکرمؐ کے حامیوں کی تعداد بہت تھی، امامِ مظلوم نے اپنے حامیوں کی تعداد نہیں بڑھائی بلکہ سفرِ غربت اختیار کیا کیونکہ ان کا مسلک جنگ و جدل نہ تھا۔ صلح و آشتی ان کا شعار تھا۔

سفرِ غربت میں حُر ملتا ہے جو ایک ہزار سپاہیوں کے ساتھ آپ کا راستہ روکنے کے لیے بھیجا گیا تھا۔ یہ دشمن کی فوج تھی، لیکن واہ رے دریادلی حسینؑ، فرزندِ ساقیِ کوثر کسی کو پیاسا نہیں دیکھ سکا، ریگ زار

میں جہاں پانی کمیاب بلکہ نایاب اور مسافروں کی جان ہوتا ہے۔ حسینؑ نے اپنے اہل حرم کے لیے پانی کا ذخیرہ محفوظ نہیں رکھا بلکہ پیاسے دشمن کو پانی پلا دیا۔ مخالفین کے کہنے سے دریائے فرات (نہر علقمہ) کے کنارے سے خیام ہٹا لینا اس کا ثبوت ہے کہ امامؑ امن کے خواہاں تھے۔ سات دن تک کربلا میں امن برقرار رکھنے کی کوشش کرنے والے امام عالی مرتبت نے یہاں تک فرمایا "وہ ملک عرب چھوڑ کر دور دراز کسی جگہ (ہندوستان) چلے جائیں۔ مگر دشمنان حسینؑ کی نیت تو کچھ اور ہی تھی۔

نویں کی رات خیمہ کی شمع گل کرنا تاکہ جانے والے کی نظر نیچی نہ ہو، امامؑ کی اعلیٰ ظرفی کا ثبوت ہے۔ تمام رات عبادت میں گزاری۔ یعنی جنگ کے میدان میں بھی خدا سے لو لگائے رہے۔ قرآن پاک میں فرمایا گیا ہے "جہاد فی سبیل اللہ"۔ امام اور ان کے ساتھیوں نے مثال پیش کی کہ جنگ اگر کرنا ہے تو صرف حفاظتِ دین کے لیے۔ زر، زن، زمین۔ کے لیے نہیں، بادشاہت کے لیے نہیں، طبقاتی کشمکش کے لیے نہیں۔ جنگ برائے جنگ نہیں، دشمنوں کو ذلیل کرنے کے لیے نہیں۔ اگر شمشیر اٹھانی ہے تو ظلم کے خلاف حمایتِ حق کے لیے، وہ بھی تب، جبکہ امن کی تمام کوششیں ناکام ہو جائیں۔ کربلا کے واقعات پر نظر ڈالیے اور غور فرمائیے۔ انسانی تاریخ جو جنگ و جدل کی ہزار ہا داستانوں سے بھری ہے، میں کیا کوئی ایسی اور جنگ بھی لڑی گئی ہے۔ سانحۂ کربلا معرکۂ خیر و شر تھا۔ جنگِ کفر و ایمان تھی۔ ظلمت و نور برسرِ پیکار رہے۔

کربلا کے سانحہ کی اہمیت کے تمام پہلوؤں کو دائرہ تحریر و تقریر میں لانا ممکن نہیں کیونکہ عقلِ انسانی ہنوز مدارج ارتقا طے کر رہی ہے۔ اس جنگ نے شکست و فتح کے معیار بدل ڈالے ہیں۔ عورتوں، بچوں، بوڑھوں، جوانوں، رفیقوں نے محبت و ایثار، قربانی و وفاشعاری کی ایک ایسی مثال قائم کی ہے جو نسلِ انسانی کے لیے شمعِ ہدایت بن گئی۔ اہلِ جہاں کو شہیدوں نے فنا ہو کر بقا کا سبق دیا۔ امام حسینؑ کی دنیاوی حیات کی شمع گل ہو کر آفتابِ شہادت بن گئی، ایک ایسا آفتاب جو نہ کبھی غروب ہوتا ہے، نہ اس میں گہن لگتا ہے۔ جس کی تابانی سے بلا تفریق مذہب و ملت تمام انسانوں کو ایمان کی ضیا ملتی ہے۔ مہاتما گاندھی نے جنگِ آزادی کے دوران فرمایا تھا:

"ہندوستان کی اگر نجات ہو سکتی ہے تو ہم کو حسینی اصولوں پر عمل کرنا چاہیے"

ایک مولانا نے گاندھی جی سے پوچھا "آپ کا طریق کار اور ساتھیوں کی کم تعداد کیا انگریزوں کے خلاف آپ کو کامیابی دلا سکتی ہے؟" ـــــ گاندھی جی نے کہا:

"یہ آپ کہہ رہے ہیں جن کے پاس حسینؑ کی مثال موجود ہے۔؟"

کربلا کی جنگ کو حادثاتِ عالم میں منفرد مقام حاصل ہے۔ یہ معرکہ ان اعلیٰ اقدار کے لیے تھا جن پر تہذیب انسانی کا انحصار ہے۔ جو ہر دور میں انسانیت کی ضامن رہی ہیں۔ بقول جواہر لعل نہرو، کربلا تاریخ کا ایک سین اور وہ واقعہ، وہ عظیم اور جادوانی اثر، غم انگیز ہے جو انتہائی مخالف ماحول میں انسانی قوتِ ارادی کی جیت ہے۔ انسانی شعور کا ارتقا جیسے جیسے ہوتا جاتا ہے اور عقل تابندہ ہوتی جاتی ہے، معرکۂ کربلا کے نئے معانی، نئی جہتیں، نئے پہلو اور نئے گوشے ابھرتے ہی رہتے ہیں۔ سانحۂ کربلا اپنی رفعت، تنوع، ہمہ گیری کے سبب اہلِ دل کے لیے ایک منبعِ فکر و یقین بن گیا ہے۔ اس کے اثرات کی جڑیں اخلاقیات و فلسفہ، شعر و ادب، تاریخ و سیاست میں گہری پیوست ہیں۔ اس دلگداز واقعہ نے ہر صاحبِ ایماں کی آنکھوں کو پرنم کیا ہے۔ مفکروں نے اس سے استفادہ کیا، لیکن سب سے اہم سبق وہ ہے جو اہلِ عالم کو ملا، یعنی اعلیٰ اقدار کے لیے مشکل ترین امتحانات میں بھی پائے ثبات متزلزل نہ ہو۔ ایمان کی آبرو رہ جائے۔ یہی ہے پیغام شبیرؑ۔ حسینؑ اور ان کے ساتھیوں نے ایمان کی آبرو رکھی۔ حضرت انیس لکھنوی فرماتے ہیں ؎

سیر چشموں کو غمِ تشنہ دہاں کیا ہے
آبرو دہر میں رہ جائے تو پانی کیا ہے

یومِ عاشور کو حسینؑ اور ان کے ساتھیوں نے فجر کی نماز ادا کی۔ دشمنانِ دین کا رویہ کیا تھا۔ ان نام نہاد کلمہ گویان نے نمازیوں پر تیر برسائے۔ دسویں کو پہلا تیر یزیدی لشکر کی طرف سے ہی آیا۔ میدانِ جنگ میں بھی حسینؑ، اشقیا کے ضمیر کو بیدار کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ ننھے اصغرؑ کو لشکرِ عدو کے سامنے لائے کہ معصوم شیر خوار کو دیکھ کر شاید دشمنوں کے دل میں جذبۂ ترحم پیدا ہو۔ پیکرِ شجاعت حسینؑ، جنگ پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ ہر ممکن کوشش کرتے رہے کہ جنگ نہ ہو۔ اس وقت کوئی موقع پرست سیاست داں ہوتا تو شاید وہ صلح کا سہارا لے کر صرف دکھاوے کے لیے بیعت کر لیتا اور ذہن میں یہی خیال کارفرما رہتا کہ مناسب موقع ملتے ہی بیعت سے انکار کر کے علمِ بغاوت بلند کر دیں گے۔ مگر نواسۂ رسولؐ کا ایمان مصلحت پر نہیں، عقیدہ کے استحکام پر قائم تھا۔ ایسے وقت جسے دنیا والے مصلحت کہتے ہیں، دراصل ایمان کی موت ہوتی ہے۔ قول اور فعل میں تضاد، عقیدہ اور ایمان کی خودکشی کے مترادف ہوتا ہے۔ امامؑ بیعت نہیں کرتے، ظلمتِ کفر کی فضیلت قبول نہیں فرماتے۔ حق و باطل کا امتیاز ختم نہیں ہونے دینا چاہتے تھے۔ پاکیزگیٔ نفس کو فسق و فجور کے آگے سرنگوں ہونے دینا نہیں چاہتے تھے۔ بیعت کا

مطلب تو یہ ہوتا کہ اندھیرا روشنی کو نگل جاتا۔ لیکن امام برحق زمانہ کے لیے ایک مثال قائم کرتے ہیں کہ جابر کے آگے سر تسلیم خم نہیں ہونا چاہیے۔

سر بڑھے تو قدم راہِ حق میں اور جمے   حسینؑ نام ہے پُر جوش استقامت کا

عزیزوں اور رفقائے حسینؑ نے ہمیں وفاداری کی عظمت کا سبق سکھایا۔ وفاداری بھی ایسی کہ ہر ایک' جان نثار کرنے میں سبقت لے جانا چاہتا تھا۔

حسینیت کا پیغام تمام اہلِ جہاں اور ہر دَور کے لیے ہے۔ آج کے دَور میں تو یہ اور بھی اہم ہے۔ اب مصلحتیں جزوِ ایمان ہوتی جارہی ہیں۔ آرام و آسائش پر اصولوں کی قربانی دی جارہی ہے۔ وفاداریاں موقع پرستی پر مبنی ہیں۔ لوگوں نے مسلکِ خاموشی اختیار کر رکھا ہے۔ ظلم ہوتا رہتا ہے۔ لوگ دیکھتے رہتے ہیں۔ لیکن ظالموں کے خلاف آواز بلند نہیں کرتے۔ حسینؑ کا پیغام یہی ہے ' انصاف و ایمان کا دامن کبھی مت چھوڑو۔ امتحانِ حیات میں صبر و رضا سے کام لو۔ ہر حال میں شکرِ الٰہی کرو۔ مشکل سے مشکل وقت میں بھی عقائد پر مضبوطی سے جمے رہو۔ ظلم کے آگے سر خم نہ کرو۔ کارزارِ حیات میں عبادت کی اہمیت سمجھو۔ کربلا کے میدان میں ادا کی جانے والی نمازِ زیرِ خنجر اور حسینی سجدہ کو ہمیشہ پیش نظر رکھو۔ جنگ سے باز آؤ۔ آج ہماری زندگی عالمی سیاست میں داؤ پر لگی ہے۔ حسینؑ نے جنگ ٹالنے کے لیے کیا کیا نہ کیا۔ ہم بھی امنِ عالم کے لیے کوشاں رہیں لیکن حمایتِ حق میں جان دینے سے گریز نہ کریں۔ حسینی لشکر کی جنگ جارحانہ نہیں' مدافعانہ تھی۔ امام حسینؑ اور ان کے ساتھیوں کا کردار ہمارے لیے مشعلِ راہ ہے۔ آج کے تباہ کن اسلحوں کی ہولناک جنگی دوڑ میں حسینیت ہمیں صحیح راہ دکھاتی ہے۔

سانحۂ کربلا ایک تاریخی المیہ، ایک مقدس واقعہ، ایک کوششِ انقلاب تھی۔ امام حسین علیہ السلام دین و ایمان، احساس و آگہی، صبر و رضا، پاکیزگیٔ نفس، فکر و عمل کی ہم آہنگی اور ہمہ گیری کے علمبردار ہیں۔ مدافعت کے لیے رزم آرائی کو حسینؑ نے ایک نیا انداز دیا۔ شکست و فتح کے معیار کو نئے معانی ملے یعنی' جو دلوں کو فتح کرے وہی فاتحِ زمانہ '۔ کربلا میں بظاہر صاحبانِ حق کی دنیاوی حیات کے جو چراغ گُل ہو گئے تھے' وہ ہمارے دلوں میں سراجِ منیر بن کر رہنمائی کر رہے ہیں۔ ہمشکلِ پیغمبرؐ کی اذان کی خاموش گونج آج بھی ہر صاحبِ ایمان کے کانوں میں گونج رہی ہے۔ عباس علمدارؑ کی وفا و شجاعت کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ حضرت زینبؑ کا جہادِ تقریر ہمارے لیے ایک سبق ہے۔ حسینؑ اور ان کے تمام عزیزوں اور رفقاء نے ہماری فکر و عمل کو روشنی بخشی ہے۔

گو جام شہادت کا پیے جاتا ہے دنیا کو وہ پُر نور کیے جاتا ہے
اے اسمٰن چراغِ خاندانِ نبویؐ گُل ہو کے بھی روشنی دیے جاتا ہے

ایک مُصلح کی کامیابی کا ثبوت یہ ہے کہ دنیا نے اس سے کیا سیکھا۔ کتنے دلوں میں قوت و حرارتِ ایمانی آئی۔ کتنے ذہن بیدار ہوئے۔ آج کے سیاست داں سمجھتے ہیں سیاست اور جنگ میں سب کچھ جائز ہے۔ مگر آج سے تقریباً ۱۳ صدی قبل حسینؑ نے یہ سبق سکھایا کہ سیاست حق پر مبنی ہونی چاہیے، خواہ اس کے لیے کچھ بھی قیمت کیوں نہ دینی پڑے۔ یہی بات مذہب کے متعلق ہے۔ وہاں بھی جذبۂ رواداری، انکسار، ضمیر کی آزادی اور یقینِ محکم کے ساتھ صراطِ مستقیم پر گامزن رہنا چاہیے۔ اخلاقِ حسینی میں یہ بھی ایک مثال ہے کہ ادنوں کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔ جاں بلب غلام جونؑ کی صدا کان میں آئی تو شاہِ مظلوم نے میدانِ جنگ میں جا کر اس کا سر اپنے زانو پر رکھ لیا۔ جب اہلِ حرم سے رخصت کے وقت کا آخری سلام کیا تو فضہ کو نہ بھولے۔ حسینؑ نے حرمتِ حق کا تحفظ کیا۔ صاحبِ اقتدار کا عمل جو سنت بنتا جا رہا تھا کربلا کے بعد فعلِ انفرادی رہ گیا۔ اجتماعی خطوط مٹ گیا۔ لوگوں کی جرأتِ اظہار ختم ہونے سے بچ گئی۔ قوتِ احساس بیدار ہوئی۔ آج دنیا والے حسینؑ سے سیکھیں اور حسینیت پر عمل پیرا ہیں تو امن عالم قائم رہے گا، ایمان تر و تازہ رہے گا، انسانیت زندہ رہے گی۔ حسینؑ ابن علیؑ کو سلام کے ساتھ اس مقالہ کا اختتام کرتا ہوں ؎

حسینؑ ابن علیؑ کو سلام کرتا ہوں
کہ اس سے کسبِ فیوضِ دوام کرتا ہوں
نہیں ہے علت آمیز بندگی میری
پئے طہارتِ دل اہتمام کرتا ہوں

اطلاع نامہ بابت پیغامِ ثقلین

بموجب

فارم۔۴

مقام اشاعت: اہل بیت کمپلکس، کالندی کنج روڈ، ابوالفضل انکلیو II جامعہ نگر اوکھلا، نئی دہلی ۲۵۔

وقفۂ اشاعت: سہ ماہ

پرنٹر: سید محمد عسکری

قومیت: ہندوستانی

پتہ: ۱۷۶۸۔ حوض سوئیوالان، نئی دہلی ۲

پبلشر: سید محمد عسکری

قومیت: ہندوستانی

پتہ: ۱۷۶۸۔ حوض سوئیوالان، نئی دہلی ۲

ایڈیٹر: سید محمد عسکری

قومیت: ہندوستانی

پتہ: ۱۷۶۸۔ حوض سوئیوالان، نئی دہلی ۲

مالک: سید محمد عسکری

قومیت: ہندوستانی

پتہ: ۱۷۶۸۔ حوض سوئیوالان، نئی دہلی ۲

میں سید محمد عسکری، بقائی ہوش وحواس اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم و یقین کے مطابق درست ہیں۔

دستخط

سید محمد عسکری

مختلف حالات میں

انسان کی ذمہ داریاں

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

الدھر یومان، یوم لک و یوم علیک فاذا کان لک فلا تبطر و اذا کان علیک فاصطبر.

ایام دو طرح کے ہیں، ایک دن تمہارے نفع میں ہے اور ایک دن تمہارے ضرر میں۔ جو دن تمہارے نفع میں ہے اس میں تند روی نہ کرو اور جو دن تمہارے ضرر میں ہے اس میں بردباری اختیار کرو۔

اس روایت میں بہترین اور خوبصورت انداز میں عمر کے ایام کو دو دنوں میں خلاصہ کیا گیا ہے۔ یعنی تمام ایام جو گزرے ہیں یا انسان کے حق میں ہیں یا اس کے نقصان میں ہیں، ان دو حالتوں سے خالی نہیں ہیں۔ اگر ابتداء سے انتہا تک انسانی زندگی پر ایک طائرانہ نظر ڈالی جائے تو یہ حقیقت روشن ہو جائے گی کہ عمر کے لمحات ہمیشہ خوشی و غم، سختی و سہولت کشکش اور سکون اور بیماری و تندرستی کے ساتھ ہیں کبھی بھی عمر ایک طرح نہیں گزرتی کہ خوشی ہی خوشی ہو یا صرف غم ہی غم ہو یا یہ کہ ہمیشہ سکون و اطمینان سے گزرے اور اس کی زندگی رنج و ملال سے بالکل خالی ہو۔

انسان کو ابتداء سے اس شناخت و بصیرت کی طرف توجہ رکھنی چاہیے کہ دنیا کے وجود کا فلسفہ مطلق سلامتی و خوشی یا یکنواخت رنج و غم نہیں ہے بلکہ ہمیشہ رنج و سختی بلا و مصیبت کے ہمراہ ہے مصائب و آلام سکون و اطمینان میں مضمر ہے یعنی انسان کی پوری عمر متضاد حالات و کیفیات کا آمیزہ ہے۔

جب انسان اس حقیقت کو درک کر لیتا ہے اور اس کے لیے ثابت ہو جاتا ہے کہ دنیا متضاد حالات و شرائط سے آمیختہ ہے اور انسانی ترقی و کمال ان ہی شدائد، رنج و غم، اطمینان اور خوشی سے ہو کر گزرتا ہے اور وہ ان ہی سائل

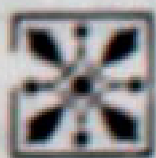
کے ذریعہ آزمایا جاتا ہے اس کی تربیت ہوتی ہے اور اسے کمال نصیب ہوتا ہے تو اس وقت جو دن اس کے نفع میں ہے اس سے انتہائی فائدہ اٹھاتا ہے اور جو دن اس کے ضرر میں ہے اس پر صبر و بردباری کا مظاہرہ کرتا ہے۔

پہلا فیصلہ اس بات کا سبب بنتا ہے کہ انسان اس کے باعث اس وقت اور فرصت کو ہاتھ سے نہ جانے دے۔ ناحق انتہا پسندی اور افراط کے باعث معصیت اور گناہ میں مبتلا نہ ہو۔ بلکہ ہر امتیاز سے مکمل اور مناسب استفادہ کرے اور نعمتوں کو اس کے تعیین شدہ راستہ سے کہ جس سے خدا کی رضایت و خوشنودی حاصل ہوتی ہے اور انسان کو انفرادی و اجتماعی سلامت و سعادت سے ہمکنار کرتی ہے فائدہ اٹھائے۔

دوسرا فیصلہ انسان کو ناامیدی اور اضطراب سے رہائی دلاتا ہے اور غور و فکر کی طرف توجہ دلاتا ہے اور سے عمدہ، غیر صحیح اور غیر شرعی نامعقول اقدامات سے بچاتا ہے کیوں کہ یہ لمحات جو انسان کے ضرر میں ہیں اور اس کے طبعی میلانات اور تقاضوں کے برعکس ہیں اور رنج و غم اور سختی نے سکون و اطمینان اور خوشی کی جگہ لے لی ہے یہ دنیوی زندگی کی طبعی سیر کے بخلاف نہیں ہے۔ اور دنیوی زندگی نے ویسی ہی تبدیلی و تغیر اپنایا ہے جس کا حالات تقاضا کرتے تھے۔

حضرت علی علیہ السلام ہمیں اس واقعیت میں تعقل و تفکر کی دعوت دیتے ہیں کہ انسان کے حالات اور ایام زندگی کی اعتبار سے دو قسم کے ہیں یا نفع میں ہیں یا ضرر میں۔ حضرتؑ ہمیں اس بات کی دعوت دیتے ہیں کہ جو ایام انسان کے مزاج کے مطابق گزر رہے ہیں اور خوشی، خوش حالی اور آسائش، غم واندوہ و فقر و محرومیت پر غالب ہیں کہیں ان میں ہم انتہا پسندی کا شکار نہ ہو جائیں اور پاکیزگی و عفت کے راستے سے نکل کر طغیان و معصیت کے دلدل میں نہ پھنس جائیں۔

اور ایسا نہ ہو کہ جو ایام ہمارے ضرر میں ہیں ان میں صبر و بردباری کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جائے اور ذلت و خواری کا شکار ہو جائیں اور کائنات کی تمام مخلوق کو اپنے اور اپنی خواہشات کے خلاف محسوس کرنے لگیں۔



سیرتِ امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام

سنہ ۳ ہجری میں رمضان المبارک کی پندرھویں تاریخ کو بیت نبوت سے رسولِ اسلامؐ کے پہلے نواسہ کی ولادت کی خبر کا اعلان ہوا۔ رسولِ خداؐ کو جیسے ہی یہ بشارت ملی، آپ نے فوراً جناب فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کو مبارکباد دینے اور اپنی دلی مسرت کا اظہار کرنے کے لیے شہزادی کے بیت الشرف کا رُخ کیا۔

جب مبارک نومولود کو رسولِ خداؐ کی خدمت میں پیش کیا گیا تو آنحضرتؐ نے اپنے پورے وجود کے ساتھ اس کا استقبال فرمایا۔ اسے اپنے ہاتھوں پر لے کر بوسے دیے، سینے سے لگایا۔ پھر اس کے دائیں کان میں اذان اور بائیں کان میں اقامت کہی تاکہ بچّہ کے کان میں پہنچنے والی پہلی آواز، حق کی آواز ہو۔

اس کے بعد رسولِ خداؐ نے حضرت علیؑ کی طرف رُخ کر کے فرمایا:

"میرے بیٹے کا نام کیا رکھا ہے؟"

حضرت علیؑ نے فرمایا:

"میں اس سلسلہ میں آپ پر سبقت کیسے لے جا سکتا ہوں؟"

پیغمبرِ اسلامؐ نے فرمایا:

"اور میں بھی اپنے پروردگار پر سبقت نہیں لے جا سکتا۔"[1]

---

[1] ذخائر العقبیٰ / ص ۱۲۰۔

گفتگو میں لحاظِ ادب:

بیٹا! گفتگو کرتے وقت چیخنے اور چلّانے سے اجتناب کرو یعنی ادب و احترام کا پورا پورا لحاظ رکھو۔ ایسا نہ ہو کہ جب اپنی کوئی بات دلیل و استدلال کے ذریعہ ثابت نہ کر سکو تو چیخ پکار کا سہارا لے کر اپنی بات دوسروں پر مسلط کرنے کی کوشش کرو جس طرح بعض چوپائے بلا سبب چیخ پکار مچایا کرتے ہیں ـــ اور بدترین آواز ان ہی کی آواز ہے۔

الٰہی نعمتیں:

الم تروا ان اللہ سخر لکم ما فی السمٰوات وما فی الارض (لقمان / ۲۰)

کیا تم نے مشاہدہ نہیں کیا ہے کہ زمین و آسمان میں جو کچھ ہے، خداوند عالم نے اسے تمہارے لیے مسخر کر دیا ہے۔

قرآن کریم لقمان کی نصیحتیں نقل کرنے کے بعد ایک دوسرے نکتہ کی طرف اشارہ کرتا ہے اور انسان کو خداوند عالم کی رنگ برنگی نعمتوں کی طرف متوجہ کرتا ہے۔

البتہ اگر آیت کے زمانِ نزول کو مدّ نظر رکھا جائے تو آیت کا خطاب صرف پیغمبر اسلام کے ہم عصر مشرکوں سے ہے لیکن علم اصول کے ماہروں کا نظریہ ہے کہ قرآن مجید کی آیتیں عام ہیں، نزول کے وقت موجود مخاطبین سے مختص نہیں ہیں مگر یہ کہ کوئی خاص دلیل کسی آیت کو مختص کر دے، کیونکہ قرآن مجید قیامت تک آنے والے تمام انسانوں کے لیے ہے اور اسے نازل کرنے والا تمام انسانوں کا خالق ہے جو ہر وقت اور ہر جگہ حاضر و ناظر ہے۔

تسخیر موجودات:

بنابریں "اَلَم تَروا۔۔۔" کا خطاب تمام انسانوں سے ہے، قرآن سب سے کہہ رہا ہے "کیا تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا نہیں ہے کہ زمین و آسمان میں موجود قسم قسم کی مخلوقات کو خداوند عالم نے تمہارے فائدہ کے لیے مسخر کر دیا ہے تاکہ تم ان سے فائدہ اٹھا سکو۔"

ابھی یہ گفتگو ختم بھی نہ ہوئی تھی کہ رسولِ خدا پر وحی نازل ہوئی کہ خداوندِ عالم نے اس مبارک بچّہ کا نام "حسن" رکھا ہے۔[1]

جب اس مبارک ولادت کا ساتواں دن آیا تو رسولِ خداؐ نے ایک مینڈھا ذبح کروا کے اس بچّہ کا عقیقہ کیا۔ اس مبارک بچّہ اور اس کی پاک و پاکیزہ ماں کے سلسلہ میں قابلہ کی زحمتوں کے بدلہ میں اور اس کی قدردانی کے طور پر مینڈھے کی ایک ران اور ایک دینار اسے عطا کیا۔ اس کے بعد بچّہ کا سر مونڈ کر، اس کے بالوں کے وزن کے برابر چاندی کا صدقہ دیا اور سر پر خلوق نامی عطر لگایا۔

رسولِ خدا اپنے نواسہ امام حسنؑ کے سلسلہ میں جو کچھ مراسم بجالائے وہ بعد کے مسلمانوں کے لیے سنّت قرار پا گئے۔

امام حسنؑ، قرآن و سنّت کی روشنی میں:

اہلِ بیتؑ میں شامل تمام افراد کی طرح، امام حسنؑ کی بھی قرآن مجید کی نظر میں ایک خاص عظمت اور مخصوص مقام ہے جس کا تذکرہ ہم گزشتہ مقالات میں کر چکے ہیں۔ یہاں ہم صرف ان بعض احادیث کی جانب اشارہ کرنے پر اکتفا کریں گے جو آپ کی عظمت اور اعلیٰ مرتبت کے سلسلہ میں رسولِ اکرمؐ نے بیان فرمائی ہیں۔

۱۔ بخاری و مسلم نے "براء" سے روایت کی ہے کہ میں نے دیکھا کہ حسنؑ آنحضرتؐ کے دوش پر سوار ہیں اور حضورؐ فرما رہے ہیں:

اللّٰھم انی احبہ فاحبہ

خدایا! میں حسن کو دوست رکھتا ہوں، تو بھی اسے دوست رکھ۔

۲۔ ترمذی نے ابن عباس سے روایت کی ہے کہ رسولِ خدا حسنؑ کو اٹھائے ہوئے تھے، یہ منظر دیکھ کر ایک شخص نے کہا: "بیٹا کتنی اچھی سواری پر بیٹھے ہوئے ہو؟" یہ سن کر رسولِ خدا نے فرمایا:

"ونعم الراکب ھو" اور یہ سوار کتنا اچھا ہے۔

---

[1] اہل البیت، توفیق ابو علم، ص ۲۶۳۔

۳۔ حافظ ابو نعیم نے ابو بکر سے روایت کی ہے کہ:

"رسولِ خدا ہم لوگوں کو نماز پڑھا رہے تھے جب حضور سجدہ میں گئے تو اتنے میں حسنؑ آگئے، جو اس وقت بچے تھے اور آپؐ کی پشت پر سوار ہوگئے اور ایک مرتبہ آپ کی گردن پر بیٹھ گئے، مگر رسولِ خدا نے انھیں بہت آہستہ سے اٹھایا۔ چنانچہ جب رسولِ خدا نماز سے فارغ ہوئے تو لوگوں نے کہا: "اے اللہ کے رسولؐ آپ اس بچے سے ایسا برتاؤ کرتے ہیں جیسا کسی کے ساتھ نہیں کرتے" رسولِ خدا نے جواب دیا۔

ان ھذا ریحانتی۔ بے شک یہ میرا گلدستہ ہے۔

۴۔ انس بن مالک کہتے ہیں کہ جب رسولِ خدا سے سوال کیا گیا کہ آپ اپنے اہلِ بیتؑ میں سب سے زیادہ کس سے محبت کرتے ہیں؟ تو حضورؐ نے فرمایا:

"حسنؑ و حسینؑ سے۔"

۵۔ عائشہ ناقل ہیں کہ آنحضرتؐ حسنؑ کو اپنے سینہ سے لپٹا کر فرماتے تھے:

اللھم ھذا ابنی، وانا احبہ فاحبہ واحب من یحبہ

خدایا یہ میرا فرزند ہے۔ میں اس سے محبت کرتا ہوں، پس تو بھی اس سے محبت کر اور جو اس سے محبت کرے تو اس سے محبت کر۔

۶۔ جابر بن عبداللہ انصاری کا بیان ہے کہ رسولِ خدا نے فرمایا ہے:

من سرہ ان ینظر الی سید شباب اھل الجنۃ فلینظر الی الحسن بن علی۔

جسے جنت کے جوانوں کے سردار کو دیکھ کر مسرت ہوتی ہے، وہ حسنؑ بن علیؑ کو دیکھے

۷۔ یعلی بن مرہ کہتے ہیں:

"ہم پیغمبرؐ کے ہمراہ ایک جگہ دعوت کھانے جا رہے تھے۔ راستہ میں حسنؑ کھیل رہے تھے۔ ان پر نظر پڑتے ہی رسولِ خدا سب کے سامنے ان کی طرف دوڑے اور اپنا ہاتھ پھیلا کر کبھی ادھر سے گزرتے تھے اور کبھی ادھر سے۔ اس طرح آپ حسنؑ کو ہنساتے رہے، یہاں تک کہ انھیں پکڑ کر اپنا ایک ہاتھ ان کی گردن پر رکھا اور دوسرا ہاتھ ان کے سر پر۔ پھر انھیں گلے سے لگا کر ان کا بوسہ لینے لگے اور فرمایا۔

حسن منی وانا منہ احب اللہ من احبہ۔ حسنؑ مجھ سے ہیں اور میں حسنؑ سے ہوں۔ خدا

اس کے دوستداروں کو دوست رکھے۔

۸۔ غزالی احیاء العلوم میں لکھتے ہیں کہ:

"پیغمبر اسلامؐ نے حسنؑ کو مخاطب کر کے فرمایا: اشبھت خلقی وخلقی۔ تم سیرت و صورت میں میری شبیہ ہو۔"

۹۔ رسول خداؐ ہی کا ارشاد ہے:

"الحسنؑ والحسینؑ امامان قاما او قعدا۔

حسنؑ و حسینؑ ہر حال میں امام ہیں چاہے جنگ کریں یا صلح۔"[۱]

ان حدیثوں سے اسلامی دنیا میں، نواسۂ رسولؐ حضرت امام حسنؑ کی عظمت اور آپؑ کی اعلیٰ مرتبت بخوبی روشن ہو جاتی ہے۔

شخصیت کے نقوش:

امام حسنؑ عبادت و تقویٰ اور خدا سے تقرب میں اپنی مثال آپ تھے۔ امام جعفر صادقؑ سے روایت ہے کہ:

"ان الحسنؑ بن علیؑ کان اعبد الناس فی زمانہ وازھدھم وافضلھم

حسنؑ بن علیؑ اپنے زمانہ میں سب سے زیادہ عبادت گزار، سب سے بڑے زاہد اور سب سے افضل تھے۔"

روضۃ الواعظین میں ہے کہ:

"امام حسنؑ جس وقت نماز ادا فرماتے تھے تو آپؑ کے جسم کا بند بند کانپنے لگتا تھا، آپؑ کا رنگ زرد ہو جاتا تھا۔ جب آپؑ سے اس کا سبب دریافت کیا گیا تو آپؑ نے فرمایا: حق علی کل من وقف بین یدی رب العرش ان یصفر لونہ وترتعد مفاصلہ۔ حق یہ ہے کہ رب عرش کی بارگاہ میں کھڑے ہونے والے ہر شخص کا رنگ زرد ہو جانا چاہیے اور اس کے جسم کے بند بند کو تھرتھرانا چاہیے۔"

امام حسنؑ جب مسجد کے دروازہ پر پہنچتے تھے تو اپنا سر اٹھا کر فرماتے تھے:

---

[۱] یہ حدیث صحیح حدیثیں ابن صباغ مالکی کی "الفصول المہمہ"، طبرسی کی "اعلام الوریٰ"، استاد توفیق ابو علم کی "اہل البیتؑ"، سید محسن امین عاملی کی "المجالس السنیۃ" سے نقل کی ہیں اور اس کے علاوہ بھی دوسری بہت سی کتابوں میں یہ حدیثیں موجود ہیں۔

"الٰھی ضیفک ببابک، یا محسن قد اتاک المسیٔ فتجاوز عن قبیح ماعندی بجمیل ماعندک یاکریم۔

اے میرے اللہ! تیرا مہمان تیرے دروازہ پکڑا ہوا ہے۔ اے محسن، تیری بارگاہ میں خطا کار حاضر ہوا ہے۔ اے کریم تو اپنی خوبیوں کے طفیل میں میری برائیوں سے درگزر فرما۔"

جب آپ کے سامنے موت اور قبر کا تذکرہ ہوتا تھا تو آپ رونے لگتے تھے اور جب قیامت کے دن خدا کے حضور میں پیشی کا ذکر ہوتا تھا تو آپ چیخ مار کر بے ہوش ہو جاتے تھے۔

امام صادق علیہ السلام کا بیان ہے کہ:

اَنّ الحسنؑ بن علیؑ حج خمسا وعشرین حجة ماشیا وقاسم اللہ تعالٰی ماله مرتین[1]۔

حسنؑ بن علیؑ ۲۵ مرتبہ پا پیادہ حج بجالائے تھے اور دو مرتبہ اپنا سارا مال خدا کی راہ میں تقسیم کر دیا تھا۔

امام حسنؑ کا حسنِ خلق، اہلِ بیت علیہم السلام کے اعلیٰ اخلاق کا بہترین نمونہ تھا۔ لوگوں کے ساتھ آپ کے حسنِ سلوک اور اخلاق کے چند نمونے ہم یہاں پیش کر رہے ہیں تاکہ ہم ان سے سبق حاصل کر کے اپنے لیے نمونۂ عمل بنائیں۔

۱۔ سیرت کی کتابوں میں ہے کہ امام حسنؑ کا گزر فقیروں کی ایک جماعت کے پاس سے ہوا، جو زمین پر بیٹھے ہوئے، راستہ سے چنے گئے روٹی کے ٹکڑے کھا رہے تھے۔ فقیروں نے امام حسنؑ کو دیکھ کر اپنے ساتھ کھانے میں شریک ہونے کی دعوت دی۔ آپ نے یہ فرماتے ہوئے کہ "ان اللہ لایحب المتکبرین" (خدا متکبروں کو دوست نہیں رکھتا) ان کی دعوت قبول فرمائی۔

اور جب ان کے کھانے سے فارغ ہو گئے تو آپ نے ان لوگوں کو اپنے یہاں کھانے کی دعوت دی۔ آپ نے انھیں کھانا کھلایا، کپڑے دیئے اور مال و دولت سے آسودہ کر دیا۔

۲۔ روایت میں ہے کہ جب آپ نے ایک بکری کو دیکھا جس کی ٹانگ ٹوٹ گئی تھی تو آپ نے

---

[1] مزید معلومات کے لیے مطالعہ کیجیے: کشف الغمہ / جلد ۲۔ مناقب آل ابی طالب / جلد ۴۔ المجالس السنیة۔ توضیح ابو علم کی "اہل البیت" اور تذکرة الخواص وغیرہ۔

اپنے غلام سے دریافت فرمایا کہ یہ کس کی حرکت ہے؟ غلام نے جواب دیا: میری۔ امامؑ نے فرمایا: تم نے ایسا کیوں کیا؟ اس نے کہا: اس طرح سے میں آپ کو مغموم و مہموم بنانا چاہتا تھا۔ امامؑ نے یہ جواب سُن کر تبسم فرمایا اور کہا: میں تجھے خوش کر دینا چاہتا ہوں۔" چنانچہ آپؑ نے اسے آزاد کر کے مال و دولت بھی عطا کی۔

۳۔ ایک دفعہ آپؑ سے کسی نے عرض کیا کہ: "کیا وجہ ہے کہ آپ کبھی کسی سائل کو خالی ہاتھ واپس نہیں کرتے؟" آپؑ نے فرمایا: "میں خدا کی بارگاہ کا سائل ہوں اور اس سے لو لگائے ہوئے ہوں۔ مجھے شرم آتی ہے کہ میں خود سائل ہوتے ہوئے کسی سائل کو خالی ہاتھ واپس لوٹا دوں۔ خدا نے میرے ساتھ یہ عادت بنائی ہے کہ وہ مجھ پر اپنی نعمتوں کا فیضان کرتا رہتا ہے۔ لہٰذا میں نے بھی اس کے ساتھ یہ عادت بنالی ہے کہ اس کی دی ہوئی نعمتوں سے لوگوں کو فیضیاب کرتا رہتا ہوں۔ مجھے خوف ہے کہ اگر میں اپنی عادت بدل ڈالوں تو خدا بھی اپنی عادت تبدیل کرلے گا۔

۴۔ امامؑ نے انصار سے چار لاکھ درہم میں ایک باغ خرید لیا۔ لیکن جب آپؑ کو یہ اطلاع ملی کہ وہ لوگ محتاج ہو گئے ہیں تو آپؑ نے وہ باغ انھیں بلا قیمت لے واپس کر دیا۔

یہ تھیں لوگوں کے ساتھ امام علیہ السلام کے حُسنِ خلق اور سیرتِ حسن کی بعض تجلیاں جو اعلیٰ اسلامی اخلاق کو عملی شکل دینے میں روشن منارہ کی حیثیت رکھتی ہیں[1]۔

اسلامی زندگی میں امام حسنؑ کا کردار:

منصبِ امامت پر فائز ہونے سے پہلے، اپنے والد ماجد کے دور میں ہی اسلامی دنیا میں آپؑ کا عملی نقش سامنے آگیا تھا جس وقت لوگوں نے حضرت علیؑ کے ہاتھ پر کھلے عام بیعت کی اور آپؑ کو علی الاعلان خلیفہ تسلیم کر لیا گیا، اسی وقت سے امام حسنؑ کا مثبت اور فعال کردار شروع ہو گیا تھا جو امیر المومنینؑ کی شہادت کے بعد اپنے اوج پر پہنچ گیا۔

سیرتِ امام حسنؑ کا تحقیقی مطالعہ کرنے والوں کے لیے یہ بات واضح ہے کہ آپؑ کا رول دو حصوں پر مشتمل ہے۔

---

[1] مزید معلومات کے لیے توفیق ابو علم کی "اہل البیت" اور سیرت کی دوسری کتابیں ملاحظہ فرمائیں۔

پدرِ بزرگوار کے عہد میں:

پدرِ بزرگوار کے عہدِ خلافت میں امام حسنؑ کے رول کا امتیاز یہ ہے کہ آپ پورے طور سے امیر المومنینؑ کے مطیع و فرماں بردار تھے۔ آپ نے صرف ایک نیک و سعادت مند بیٹے کا ہی کردار نہیں نبھایا بلکہ مطیع و فرماں بردار سپاہی کا رول بھی ادا کیا۔

آپ کی زندگی کے اس حصّہ کے کچھ اہم نقوش ملاحظہ ہوں:

۱۔ جب بصرہ میں طلحہ و زبیر کی سرکشی اور شام میں معاویہ بن ابی سفیان کی قیادت میں باغیوں کی شورش شروع ہوئی اور ان لوگوں نے امامؑ کی فوج پر حملے شروع کر دیے تو حق کے دفاع اور اس فتنہ کی آگ بجھانے کے لیے کوفہ والوں کو نصرتِ حق کے لیے آمادہ کرنے کی ضرورت پیش آئی چنانچہ امامؑ نے اس مہم کے لیے اپنے لختِ جگر امام حسنؑ کا انتخاب فرمایا اور آپ اپنے پدرِ بزرگوار کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے عمار بن یاسر کے ہمراہ کوفہ چلے گئے۔ آپ نے کوفہ والوں کے درمیان اپنے خطبوں سے ان کی ہمتوں کو بیدار کر دیا۔ ان کے اندر جوش و ولولہ کی جوت جگا دی اور انہیں پرچمِ جہاد بلند کرنے پر آمادہ کر دیا چنانچہ تھوڑی سی ہی مدت میں کوفہ میں ہر طرف سے محبت و نصرت کی صدائیں بلند ہونے لگیں۔

۲۔ بصرہ میں جنگ کے ختم ہوتے ہی معاویہ کی سربراہی میں شامی فوج حرکت میں آگئی اور اس نے صفین میں پوزیشن سنبھال لی اور حضرت علیؑ کے پاس اموی گروپ کے فوجی اقدام کی خبریں پہنچنے لگیں۔ چنانچہ حضرت علیؑ نے جب اپنی فوج کو اس سے باخبر کیا اور اس سلسلہ میں ان سے مشورہ کیا تو سب نے امیر المومنینؑ کی اطاعت و پیروی کا اعلان کیا۔ اسی دوران امام حسنؑ نے بھی کھڑے ہو کر ان کے درمیان تقریر فرمائی جس سے ان کے جوش و ولولہ میں مزید اضافہ ہوا اور ان کے حوصلے اور بھی بلند ہو گئے۔

۳۔ جب صفین میں حکمیت کا فتنہ کھڑا ہوا تو امیر المومنین حضرت علیؑ نے لوگوں کو سمجھانے اور تحکیم کے پیچھے چھپے ہوئے فتنہ سے باخبر کرنے کی بہت کوشش فرمائی اور جب حکمیت کا رسوا کن نتیجہ ابو موسیٰ اشعری کے ہاتھوں حضرت علیؑ کی تنسیف کی شکل میں ظاہر ہوا تو امامؑ کے لشکر میں بے چینی پھیل گئی اور ہر گروہ دوسرے گروہ سے برائت و بیزاری کا اظہار کرنے لگا۔ لوگ ایک دوسرے کو برا بھلا کہنے لگے۔ یہ منظر دیکھ کر امامؑ نے لوگوں کو حقائق سے باخبر کرنے کا فیصلہ فرمایا اور آپ نے یہ عظیم ذمہ داری

اپنے فرزند امام حسنؑ کے سپرد فرمائی۔ چنانچہ امام حسنؑ نے ان کے درمیان تقریر کر کے انھیں حقیقتِ حال سے آگاہ کرتے ہوئے فرمایا:

"اے لوگو! تم نے ان دونوں کے متعلق بہت گفتگو کی ہے۔ ان دونوں کو قرآن حکیم کی روشنی میں برحق فیصلہ کرنے کے لیے بھیجا گیا تھا مگر انھوں نے اپنی خواہش نفس کے مطابق فیصلہ کیا۔ اور ایسے لوگوں کو حکم نہیں کہا جا سکتا۔ یہ تو محکوم ہیں۔ عبداللہ بن قیس اشعری نے عبداللہ بن عمر کے لیے خلافت کی تجویز رکھ کر تین چیزوں میں خطا کی ہے۔ پہلے یہ کہ انھوں نے خود عبداللہ بن عمر کے باپ ۔۔ عمر ۔۔ کی مخالفت کی ہے، کیونکہ وہ عبداللہ کی خلافت کو پسند نہیں کرتے تھے۔ اسی لیے انھوں نے اپنے بعد کے لیے بنائی جانے والی شوریٰ میں ان کا نام نہیں رکھا۔ دوسرے یہ کہ خود عبداللہ بن عمر بھی اپنے کو اس کا اہل نہیں سمجھتے۔ تیسرے یہ کہ ان کی خلافت پر مہاجرین و انصار نے اتفاق بھی نہیں کیا ہے۔

اور جہاں تک حکومت اور حکم قرار دینے کا سوال ہے تو خود رسولؐ خدا نے بھی سعد بن معاذ کو حکم بنایا تھا اور انھوں نے مرضی خدا کے مطابق فیصلہ کیا تھا۔ اور اگر وہ مرضی الٰہی کے خلاف فیصلہ کرتے تو رسولؐ خدا اسے قبول نہ کرتے۔[1]"

۴۔ امام حسنؑ نے اپنے والد امام علیؑ کے دورِ حکومت میں بصرہ، نہروان اور صفین میں لڑی جانے والی تمام جنگوں میں سرگرم شرکت فرمائی اور تمام جنگوں میں آپؑ نے انتہائی اہم کردار ادا کیا ہے۔

اپنے دورِ حکومت میں:

اسلامی دنیا میں امام حسنؑ کی شخصیت کا دوسرا دور اس وقت شروع ہوا جب والد بزرگوار کی شہادت کے بعد آپ منصب امامت پر فائز ہوئے۔

امیر المومنین حضرت علیؑ نے اپنے فرزندِ ارجمند امام حسنؑ کو یہ کہتے ہوئے اپنا وصی بنایا تھا کہ:

"یا بنی! امرنی رسول اللہ ان اوصی الیک وادفع الیک کتبی و

---

[1] حیات الامام الحسنؑ / باقر شریف قرشی / جلد ۱ / ص ۳۸۵۔

سلاحی کما اوصی الیّ ودفع الیّ کتبہ وسلاحہ وامرنی ان آمرک
اذا حضرک الموت ان تدفعھا الیٰ اخیک الحسین۔"

"بیٹا! رسولِ خدا نے مجھے یہ حکم دیا تھا کہ میں تمہیں اسی طرح سے اپنا وصی بناؤں اور اپنی کتابیں اور اسلحے تمہارے سپرد کردوں جس طرح رسولؐ خدا نے مجھے اپنا وصی بنایا تھا اور اپنی کتابیں اور اسلحے میرے سپرد فرمائے تھے۔ آپؐ نے مجھے یہ بھی حکم دیا ہے کہ میں تمہیں امر کردوں کہ جب تمہاری موت کا وقت آجائے تو یہ سب چیزیں اپنے بھائی حسینؑ کے حوالے کردینا...."

اس کے بعد آپؑ نے امام حسینؑ کی طرف رخ کرکے فرمایا:

وامرک رسولؐ اللہ ان تدفعھا الیٰ ابنک ھذا۔

اور تمہارے لیے رسولِ خدا کا یہ حکم ہے کہ تم (اپنے بعد) یہ سب چیزیں اپنے اس بیٹے (امام زین العابدینؑ) کے سپرد کردینا۔

پھر آپ نے امام زین العابدینؑ کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا:

وامرک رسولؐ اللہ ان تدفعھا الیٰ ابنک محمد بن علی فاقرئہ من رسول اللہ ومنّی السلام[1]"

رسولؐ خدا نے تمہیں یہ حکم دیا ہے کہ تم (اپنے بعد) یہ سب چیزیں اپنے بیٹے محمدؑ بن علیؑ کے سپرد کردینا اور انھیں رسولِ خدا اور میری جانب سے سلام کہہ دینا۔

حضرت علیؑ کی شہادت کے بعد کوفہ اور دوسرے علاقوں میں لوگوں نے امام حسنؑ کو اپنا خلیفہ اور امیرالمومنین تسلیم کرتے ہوئے آپؑ کے ہاتھ پہ بیعت کی اور اسلامی ملک کے گوشہ گوشہ میں امیرالمومنینؑ کی شہادت اور امام حسنؑ کی جانب خلافت کے منتقل ہوجانے کی خبر پھیل گئی۔

بیعت کی خبر سن کر معاویہ لرز اٹھا اور اس نے اس نئے مسئلہ کے متعلق رائے مشورہ اور امام حسنؑ کے مقابلہ میں اپنی سیاست وضع کرنے کے لیے اپنے محل میں اپنے مشیروں کی ایک ہنگامی میٹنگ طلب

---

[1] حیاۃ الامام الحسن بن علیؑ / باقر شریف قرشی جلد ۱ ص ۵۱۵۔ اعلام الوریٰ ص ۲۰۶۔ کشف الغمۃ فی معرفۃ الائمۃ، جلد ۲ ص ۱۵۵۔

کرلی۔ میٹنگ میں یہ طے پایا کہ اہل بیت علیہم السلام کی حکومت کے خلاف ایک طرف سے دہشت گردی وبغاوت کا سہارا لیا جائے اور دوسری طرف سے اموی پارٹی کے مفادات کی حفاظت کی خاطر تحفے، پُر فریب وعدے، رشوت اور دھمکیوں وغیرہ کے ذریعہ عراق میں اثرورسوخ رکھنے والی شخصیتوں اور لیڈروں کو خریدنے کی بھرپور کوشش کی جائے۔

ادھر امام حسنؑ بھی اپنی حکومت کو مضبوط و مستحکم بنیادوں پر استوار کرنے کے لیے کوشاں تھے۔ چنانچہ اس کے نتیجہ میں امام حسنؑ اور معاویہ کے درمیان کچھ خط وکتابت بھی ہوئی لیکن بے سود رہی اور اس کی ناکامی کے نتیجہ میں جنگ کا بگل بج گیا جس کا آغاز بھی معاویہ ہی کی طرف سے ہوا۔ اس نے اپنی فوجوں کو عراق کی جانب آگے بڑھنے کا حکم دے کر جنگ کا اعلان کردیا۔

جب عراق کی جانب معاویہ کی افواج کی پیش قدمی کی خبر اسلامی حکومت کی قلمرو میں پھیلی تو امام حسنؑ نے بھی دشمن کی یلغار کا مقابلہ اور اسلامی حدود کے دفاع کا اعلان کردیا۔

آپؑ نے اپنے اس بیان کے ذریعہ امت کو جنگ کے لیے تیار ہونے کا حکم صادر فرمایا:

اما بعد فان اللہ کتب الجھاد علی خلقہ وسماہ کرھا ثم قال لاھل الجھاد اصبروا ان اللہ مع الصابرین فلستم ایھا الناس نائلین ما تحبون الا بالصبر علی ما تکرھون فاخرجوا رحمکم اللہ الی معسکرکم بالنخیلۃ حتی ننظر وتنظروا ونری وترواؔ۱؎

"خداوند عالم نے اپنی مخلوق پر جہاد کو فرض کیا ہے اور اسے "کرہ" (ناپسندیدگی) کے نام سے یاد کیا ہے پھر اس نے مجاہدوں سے کہا ہے کہ صبر کرو اور ثبات قدم سے کام لو کیونکہ اللہ صابروں کے ساتھ ہے۔ اے لوگو! تم اپنی محبوب اور پسندیدہ چیز تک نہیں پہنچ سکتے مگر یہ کہ جو چیزیں تمہیں ناپسند و ناگوار ہیں ان پر صبر کرو۔ خدا تم لوگوں پر رحمت نازل کرے تم نخیلہ میں اپنی چھاؤنی میں پہنچ جاؤ۔ یہاں تک کہ ہم بھی دیکھیں اور تم بھی دیکھو، ہم بھی مشاہدہ کریں اور تم بھی۔"

لیکن ہائے افسوس اس بیان کو سننے والوں کے کان اموی پروپیگنڈوں اور افواہوں سے پہلے ہی بھر چکے تھے چنانچہ وہ واضح و روشن حق کا دفاع کرنے کے بجائے غفلت و سستی کا مظاہرہ کرکے ذلت ورذالت کی

۱؎ شرح نہج البلاغہ، ابن ابی الحدید جلد ۱۶، ص ۳۸۔

گہری کھائی میں گر گئے۔ انھوں نے حق کے تئیں انتہائی سرد مہری سے کام لیا۔ انھوں نے جہاد کے تعلق سے اپنی ذمہ داریوں کا احساس نہیں کیا اور لشکرِ حق میں شامل ہونے کے لیے تیار نہیں ہوئے۔

البتہ اس شکست خوردہ اور پست دکاہل گروہ کے مقابلہ میں کچھ ایسے افراد بھی تھے جو اسلام کے مخلص اور اہل بیتؑ کے شیدا تھے۔ وہ امامؑ کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے فوراً اٹھ کھڑے ہوئے اور انھوں نے اپنے اخلاص کا اظہار کرتے ہوئے اس ذلت پذیر گروہ کی شدید مذمت کی اور اپنے اس موقف پر پوری دلیری و ثباتِ قدم کے ساتھ ڈٹے رہے۔

یہ مخلصین، کوفہ سے فوری طور پر کوچ کر کے امامؑ کے حکم کے مطابق، کوفہ کے قریب شام کے راستہ پر واقع "نخیلہ" نامی مقام پر قائم امامؑ کی فوجی چھاؤنی میں شامل ہوئے اور ان کے چلنے کے بعد امامؑ بھی چار ہزار کا لشکر لے کر اس امید پر وہاں آگئے کہ بعد میں بقیہ لوگ بھی ملحق ہو جائیں گے۔

امامؑ کو امید تھی کہ لوگ حق کی مدد کرتے ہوئے اسلام کے دفاع کی ذمہ داری کو نبھائیں گے۔ لیکن جب وہ اپنی جگہ سے ہلے تو انھیں لشکرِ حق سے ملحق ہونے پر آمادہ کرنے کے لیے دوبارہ کوفہ پلٹ کر آئے۔

اس طرح ایک بڑی فوج تو ضرور تیار ہو گئی لیکن اس کے حوصلے پست تھے۔ وہ پراگندگی، افسردگی اور سستی و کاہلی کا شکار تھی۔ جب یہ سب لوگ "نخیلہ" پہنچ گئے تو امامؑ نے فوج کو آراستہ کیا۔ لشکروں کے کمانڈروں کو فوجی حکمتِ عملی سے آگاہ فرمایا۔ اس کے بعد امامؑ اپنے لشکر کو لے کر "دیر عبدالرحمٰن" کی طرف آگے بڑھے۔ وہاں پہنچ کر امامؑ نے عبیداللہ بن عباس کی قیادت میں ایک ہراول دستہ مقدمۃ الجیش کے عنوان سے آگے بھیجنے کا فیصلہ کیا۔

جب ہراول دستے نے نہرِ دجلہ کے کنارے اپنی پوزیشن سنبھال لی تو امامؑ نے اپنی فوج کو آگے بڑھنے کا حکم دیا اور مدائن کے قریب "مظلم ساباط" میں پڑاؤ ڈالا۔

ابھی کچھ ہی وقت گزرا تھا کہ امامؑ کی فوج کا نقشہ ہی بدل گیا۔ ہر طرف پراگندگی، افتراق، سستی، بے چینی، اضطراب، فتنہ اور قیادت کے خلاف سازش و بغاوت کا دور دورہ ہو گیا اور ان ہی چیزوں نے امامؑ کو معاویہ کے ساتھ صلح نامہ پر دستخط کرنے پر مجبور کر دیا۔

ہم انشاء اللہ اگلی قسط میں صلح نامہ کا جائزہ لیتے ہوئے اس پر روشنی ڈالیں گے اور پوشیدہ حقائق کو اجاگر کریں گے جس سے امامؑ کی بے مثال عبقری شخصیت کو سمجھنے میں کافی حد تک مدد ملے گی۔

(..... جاری ہے)

"تسخیر" کا مطلب کسی چیز کا کسی کے ارادہ و اختیار کے تحت کرنا ہے۔ جب یہ کہا جاتا ہے کہ فلاں حیوان آپ کے لیے مسخر ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ آپ کے قابو میں ہے اور آپ اس سے بہرہ مند ہو سکتے ہیں۔

ارادی تسخیر:

مفسرین نے بیان کیا ہے کہ موجودات کی تسخیر کی دو صورتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ چیز مکمل طریقہ سے آپ کے اختیار میں ہو اور اس کی حرکات و سکنات کا تعلق آپ کی ذات سے ہو مثلاً کشتی کی تسخیر وغیرہ، جیسا کہ سورۂ ابراہیم میں ارشاد ہوتا ہے:

"وسخر لکم الفلک لتجری فی البحر بامرہ[1]"

اور کشتیوں کو مسخر کر دیا ہے کہ سمندر میں اس کے حکم سے چلیں۔

البتہ کشتی کا لفظ مثال کے لیے ذکر کیا ہے ورنہ حمل و نقل کے دوسرے وسائل بھی اسی طرح انسان کے اختیار میں ہیں۔ اس بات کی طرف سورۂ زخرف میں اشارہ ملتا ہے۔ ارشاد ہے:

وجعل لکم من الفلک والانعام ماترکبون[2]

اور تمہاری کشتیوں اور جانوروں میں سواری کا سامان فراہم کیا ہے۔

پھر دوسری آیت میں فرمایا:

لتستووا علیٰ ظھورہ ثم تذکروا نعمۃ ربکم اذا استویتم علیہ وتقولوا سبحان الذی سخر لنا ھذا وما کنا لہ مقرنین[3]

تاکہ ان کی پشت پر سکون سے بیٹھ سکو اور پھر جب سکون سے بیٹھ جاؤ تو اپنے پروردگار کی نعمت کو یاد کرو اور کہو کہ پاک و بے نیاز ہے وہ خدا جس نے اس سواری کو ہمارے لیے مسخر کر دیا ہے ورنہ ہم اسے قابو میں لا سکنے والے نہیں تھے۔

تسخیر کی اس قسم کو "تسخیر ارادی" کہا جاتا ہے۔

---

[1] سورۂ ابراہیم/۳۲۔ [2] زخرف/۱۲۔ [3] زخرف/۱۳۔

علمی سانحہ

مجلہ "توحید" جو ایک عرصے سے تشنگانِ علوم و معارف کی سیرابی کا حتی الامکان سامان بہم پہنچا رہا تھا، مشترکین کی قلت اور اکثر قارئین کا زرِ اشتراک کے سلسلہ میں عدم تعاون ادارہ کے لیے اب تک کی اشاعتوں پر ۸٫۷ خسارہ کا سبب بنا اور اس مہنگائی کے دور میں تو اتنا بڑا خسارہ برداشت کرتے رہنا ادارہ کے امکان میں نہیں ہے۔

اگرچہ کچھ افراد نے بروقت اور قبل از وقت بھی زرِ اشتراک سے نواز کر ہماری ہمت بڑھائی ہے، لیکن ان کی تعداد نہایت کم ہے۔ ہم اپنے ان کرم فرماؤں کے شکر گزار ہیں۔

مذکورہ صورتِ حال کے پیشِ نظر مجبوراً ہمیں اپنے اس باوقار علمی مجلہ کو عارضی طور پر موقوف کرنا پڑ رہا ہے۔ اگر حالات نے اجازت دی تو یہ سلسلہ پھر سے شروع کیا جا سکے گا۔ مجلہ "توحید" کے زرِ اشتراک کے طور پر جن قارئین کا چندہ ہمارے ذمہ ہے انھیں رقم کی واپسی کے سلسلہ میں خطوط لکھے جا چکے ہیں۔

رسالہ کی صورتِ حال اور توقف کی خبر پا کر ہمارے بعض کرم فرماؤں نے انتہائی رنج و غم کا اظہار کیا اور اسے جاری رکھنے کی سبیل کے سلسلہ میں استفسار کیا تو اس بابت عرض یہ ہے کہ اگر قارئین کرام واقعاً دلچسپی لیں، خود بھی دائمی ممبر بنیں اور دوسروں کو بھی دائمی ممبر بنائیں اور اس طرح کے پانچ سو مخلص افراد بھی مل جائیں تو اس رقم سے چھوٹا سا ہی سہی ایک پریس لگایا جا سکتا ہے جس سے مجلہ کی طباعت کا مسئلہ حل ہو جائے اور دوسری چیزوں کی طباعت سے اس کے دوسرے اخراجات نکل آئیں اور قارئین کرام بھی ایک دفعہ ۲۰۰۰/- روپے دے کر ہمیشہ اس علمی، فکری سرچشمہ سے فیضیاب ہوتے رہیں۔

ظاہر ہے علم دوست کثیر آبادی والے ملک "ہندوستان" میں پانچ سو دائمی ممبران کیا پانچ ہزار کی فراہمی بھی کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ البتہ مردانہ ہمت اور مجاہدانہ حوصلہ کی بہرحال ضرورت ہے۔

ہم ایک بار پھر اپنے ان کرم فرماؤں کا شکریہ ادا کرتے ہیں جنھوں نے مجلہ کے استقلال کے سلسلہ میں اپنے جذبوں کے اظہار سے ہماری حوصلہ افزائی کی ہے۔

خداوندِ عالم جملہ مومنین کی توفیقات میں اضافہ کرے۔

نوٹ: سہ ماہی "پیغامِ ثقلین" اردو اور ماہنامہ "پیغامِ ثقلین" ہندی باقاعدہ پابندی سے شائع ہوتے رہیں گے۔

امام سجاد علیہ السلام

مبلغ پیامِ عاشورہ

چوتھے امام حضرت علی بن الحسین علیہ السلام "زین العابدین" اور "سجاد" کے لقب سے مشہور ہیں۔ آپ نیمۂ جمادی الاول ۳۸ھ میں مدینہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کی والدہ کا نام "شہربانو" ہے۔ اپنے والد بزرگوار حضرت امام حسین علیہ السلام کے سایۂ عاطفت میں آپ نے زندگی گزاری اور ان کے بعد آپ نے امامت کی ذمّہ داری سنبھالی۔

اہل بیتِ رسول خدا پر نازل ہونے والی مصیبتوں کے بدترین زمانہ میں آپ نے زندگی گزاری، کیونکہ آپ کے ہی سامنے کربلا کا واقعہ رونما ہوا اور اہل بیتِ اطہار کو اسیری کا سامنا کرنا پڑا۔

اگر چوتھے امام عاشورہ کے پیغام کو دنیا کے سامنے پیش نہ کرتے تو ممکن تھا کہ امام حسینؑ کے قیام اور شہادت کی ماہیت اور اہمیت لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ رہ جاتی۔ کیونکہ اموی مشنری کی تمام تر مکارانہ کوشش یہی تھی کہ یزید کو اس کے عمل میں حق بجانب ثابت کر دیا جائے۔ امامؑ نے اہل بیت اطہار کے ساتھ اسیری کے سفر کے دوران ہر مناسب موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے لوگوں کو بیدار کرنے اور گناہوں کا احساس دلانے کی کوشش کی۔

جب کوفہ میں آپ کی پھوپھی جناب زینبؑ اور آپ کی بہن فاطمہؑ کی تقریروں سے وہاں والے شرمندہ ہو کر رونے لگے تو آپ نے سب کو چپ ہو جانے کا اشارہ کیا۔ آپ کے اشارہ پر سارا مجمع خاموش ہو گیا۔

آپ نے حمد و ثنائے الٰہی اور پیغمبرؐ پر درود و سلام بھیجنے کے بعد فرمایا:

"اے لوگو...... میں حسین بن علی بن ابی طالب کا بیٹا علی ہوں۔ میں اس کا بیٹا ہوں جس کے مال کو لوٹ لیا گیا۔ جس کے خاندان کو اسیر کر کے یہاں تک لایا گیا۔ میں اس کا بیٹا ہوں جس کو فرات کے کنارے قتل کر دیا گیا، حالانکہ انھوں نے نہ کسی کا خون بہایا تھا اور نہ کسی کا حق ان کی گردن پر تھا۔

اے لوگو! میں تم کو خدا کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ کیا تم نے میرے پدر بزرگوار کو خط لکھ کر نہیں بلایا تھا اور جب وہ تمہاری طرف آ گئے تو تم نے ان کو قتل کر دیا؟

جب رسول خدا فرمائیں گے کہ تم نے میرے خاندان کو تہ تیغ کیا، میری حرمت کا کچھ بھی پاس و لحاظ نہیں کیا۔ تم میری امت سے نہیں ہو تو اس وقت تم آنحضرتؐ کو کیا منہ دکھاؤ گے؟"

امامؑ کے جملوں نے کوفہ والوں پر بہت اثر کیا۔ مجمع سے گریہ و زاری کی آواز بلند ہوئی اور وہ ایک دوسرے کو ملامت کرنے لگے۔

اس طرح امامؑ نے خفتہ ضمیروں کو بیدار کر کے واقعہ کربلا کی عظمت کو ثابت کیا اور کوفیوں کو ان کے کالے کرتوت سے آگاہ کیا۔

دوسرے اہل بیت اطہار کے ساتھ ایک ہی ریسمان میں کس کر امام کو شام میں یزید کے دربار میں لے جایا گیا۔ آپ نے شجاعت اور دلیری کے ساتھ یزید سے فرمایا:

ماظنك برسول الله لورآنا موثقين في الحبال

اے یزید! تو نے یہ بھی سوچا کہ اگر رسول خدا ہم کو اس حالت میں اسیر دیکھیں گے تو ان پر کیا اثر ہوگا؟

امامؑ کے اس چھوٹے سے جملے نے اتنا اثر کیا کہ حاضرین رونے لگے۔

ایک شخص کا بیان ہے کہ اہل بیتؑ کے اسیروں کا قافلہ جب شام پہنچا تو مسجد کے دروازہ کے قریب انھیں اس جگہ ٹھہرایا گیا جہاں عام طور سے دوسرے اسیروں کو روکا جاتا تھا۔ ایک سن رسیدہ شامی قریب پہنچا اور اس نے کہا:

"خدا کا شکر ہے کہ جس نے تم کو ہلاک اور فتنہ کو ختم کیا۔"

جب اس کی بات ختم ہوگئی تو امام زین العابدین علیہ السلام نے فرمایا:

"میں نے تیری بات سن لی۔ تیرے دل میں جو دشمنی پوشیدہ تھی تو نے اس کو ظاہر کر دیا۔ اب

خاموشی سے میری بات سن۔ کیا تو نے قرآن کی تلاوت کی ہے؟"

اس نے جواب دیا: "ہاں۔"

"تو نے آیۂ قل لا اسئلکم علیہ اجرا الا المودۃ فی القربیٰ" پڑھی ہے جس میں خدا نے فرمایا ہے کہ اے رسول آپ کہہ دیں کہ میں اپنے قرابتداروں اور اہل بیتؑ کی دوستی کے سوا تم سے اجر رسالت کے طور پر اور کسی بات کا طلبگار نہیں ہوں۔"

شامی نے کہا "ہاں، یہ آیت میری نظر سے گزری ہے۔"

امامؑ نے فرمایا: "وہ اہل بیتؑ اور قربیٰ ہم ہیں۔"

پھر آپ نے کہا: "کیا تو نے آیۂ "آت ذالقربیٰ حقہ" کی تلاوت کی ہے جس میں خالق نے ذوالقربیٰ کو ان کا حق دیدینے کا حکم دیا ہے۔"

شامی نے کہا: "کیا واقعاً وہ آپ ہی ہیں؟"

امامؑ نے فرمایا: "ہاں، وہ ذوالقربیٰ ہم ہیں۔"

امامؑ نے آیۂ خمس واعلموا انما غنمتم من شیئ فان للہ خمسہ وللرسول ولذی القربیٰ کی تلاوت کی اور پوچھا: "تو نے یہ آیت پڑھی ہے؟"

اس نے کہا: "ہاں۔"

آپ نے فرمایا: "اس میں ذوالقربیٰ سے مراد ہم ہی ہیں۔"

امامؑ نے آیۂ تطہیر کے بارے میں سوال کیا تو شامی نے جواب دیا کہ ہاں، ہم اس آیت سے بھی واقف ہیں۔ امامؑ نے کہا وہ پاک و پاکیزہ صاحبان آیۂ تطہیر ہم ہیں۔ یہ سن کر اس نے اپنے ہاتھوں کو آسمان کی طرف بلند کیا اور تین مرتبہ کہا:

"پروردگارا! میں توبہ کرتا ہوں۔ پالنے والے میں خاندانِ پیغمبرؐ کی دشمنی سے توبہ کرتا ہوں اور ان کے قاتلوں سے بیزار ہوں۔ اس سے پہلے میں نے قرآن کی تلاوت کی تھی مگر میں حقائق سے ناآشنا تھا۔"

شام کی جامع مسجد میں یزید اور بہت سے افراد کے سامنے امامؑ کا کارنامہ بہت مشہور ہے۔ آپؑ نے مسجد کے بھرے مجمع میں اہل بیتؑ اور واقعات عاشورہ کا کچھ اس انداز سے تذکرہ کیا کہ لوگوں کی آنکھوں سے اشکوں کا سیلاب بہہ نکلا اور چاروں طرف گریہ وزاری کی آواز بلند ہوگئی۔

امام زین العابدین علیہ السلام کی روز عاشورہ کی پیغام رسانی کی تصویر کشی کرتے ہوئے شہید آیۃ اللہ مرتضیٰ مطہری فرماتے ہیں:

"بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اپنے والد بزرگوار کے بعد امام زین العابدینؑ بہت دنوں تک زندہ رہے، لیکن آپ نے تلوار نہیں اٹھائی لہٰذا وہ واقعات کربلا کو بھلا دینا چاہتے تھے۔ لیکن ہرگز ایسا نہیں ہے۔ جہاں جہاں آپ کو موقع ملا وہاں آپ نے اپنے پدر بزرگوار کے قیام کا پیغام پہنچایا اور اس کے اثرات کو باقی رکھا۔ آپ جب گریہ فرماتے تھے اور واقعۂ کربلا کو یاد کرتے تھے تو اس کا کیا مطلب ہوتا تھا؟ کیا آپ کا گریہ ایک عام آدمی کا گریہ تھا جس میں دل پر چوٹ لگنے سے آنسو نکل آتے ہیں؟ یا آپ اس عظیم واقعہ کو زندہ رکھ کر یہ بتانا چاہتے تھے کہ لوگوں کے دلوں سے یہ بات نہ مٹنے پائے کہ امامؑ نے کیوں قیام کیا تھا اور آپ کو کن لوگوں نے قتل کیا؟ اسی وجہ سے آپ گریہ کرتے تھے اور بہت زیادہ روتے تھے۔ ایک دن ایک خدمت گزار نے پوچھا کہ آقا کیا اب چپ ہو جانے کا وقت نہیں آگیا ہے؟ اس کا خیال تھا کہ امام اپنے عزیزوں کے لیے رویا کرتے ہیں آپؑ نے فرمایا یعقوبؑ کے بس ایک یوسفؑ تھے مگر قرآن نے یعقوبؑ کے جذباتِ محبت کو اس طرح بیان کیا ہے وابیضت عیناہ من الحزن۔ غم سے یعقوبؑ کی آنکھیں سفید ہوگئیں۔ میں نے تو اپنی نگاہوں کے سامنے ایک کے بعد ایک اٹھارہ یوسفوں کو زمین پر ایڑیاں رگڑتے دیکھا ہے۔ (سیری در سیرۂ ائمہ اطہارؑ ۔ آیت اللہ شہید مطہریؒ)

خلاصہ یہ کہ آپ نے جناب زینبؑ کی مدد سے امام حسینؑ کے پیغام کو پہنچا کر امام حسینؑ کے الٰہی اقدام کو تکمیل اور بقا عطا کی۔

امام حسین علیہ السلام کے پیغام کو عام کرنے، مسلمانوں کے ضمیر کو جگانے، ناواقف اذہان کو واقف کرانے اور اموی تبلیغات کو نقش برآب ثابت کرنے کے علاوہ آپ نے اسلامی تمدن اور خالص قرآنی تعلیمات کو عام کرنے کی بھی زبردست کوشش کی۔ جس کا نتیجہ تھا کہ آپ کے مکتب فکر کے پروردہ افراد نے بعد میں خود تمدن ساز بن کر اسلام کی خدمت کی۔

اسلامی تعلیمات کو وسعت عطا کرنے کے لیے حضرت زین العابدین علیہ السلام نے مختلف طریقے اختیار کیے جس میں سے ایک طریقہ یہ تھا کہ آپ نے مخصوص افراد کی تربیت کر کے انھیں اسلام کے سانچے

میں ڈھال دیا۔

آپ کے مکتب فکر کے پروردہ شاگردوں میں سعید بن مسیبؒ، ابو حمزہ ثمالیؒ، سعید بن جبیرؒ وغیرہ کا نام نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔

سعید بن جبیرؒ بڑے علمی مرتبہ کے حامل اور امامؑ کے اتنے شیدائی تھے کہ اسی محبت کی بنا پر حجاج بن یوسف کے ہاتھوں شہید ہوئے۔

افراد کی تربیت میں آپ نے بہت کوشش کی، یہاں تک کہ غلاموں کو خرید کر انھیں تربیت دیتے اور جب وہ آپ کی تعلیمات سے بہرہ ور ہو کر کسی قابل ہو جاتے تو آپ انھیں آزاد کر دیتے۔

معارف اسلام کو وسعت دینے کا ایک دوسرا راستہ دعا ہے۔ آپ نے دعاؤں کے ذریعہ دینی معارف کو عام کیا۔ "صحیفۂ سجادیہ" شیعوں کے پاس ایک گراں قدر ذخیرہ ہے جو آپ کی دعاؤں کا مجموعہ ہے۔ معارف اسلامی کو پھیلانے کے لیے آپ نے یہ ایک اچھوتا اسلوب اختیار کیا۔

دعاؤں کے ذیل میں فکری اور ثقافتی کوشش کے علاوہ آپ نے مسلمانوں کے سیاسی اور اجتماعی مسائل کو بھی ممکن حد تک پیش کرنے کی کوشش کی۔

مسلمانوں کی مشکلات کے حل کو مد نظر رکھتے ہوئے آپ نے لوگوں کو مومن اور دیندار بننے کا عملی درس بھی دیا۔ آخر کار ۱۲ محرم سنہ ۹۴ھ یا سنہ ۹۵ھ اور ایک قول کے مطابق ۲۵ محرم کو، ۵۷ سال کی عمر میں اموی خلیفہ ولید کے ہاتھوں شہید کر دیے گئے۔ آپ کا جسم اطہر مدینہ کے قبرستان "جنت البقیع" میں مدفون ہے۔

خداوند عالم آپ پر اور آپ کے اجداد طاہرین پر بے شمار رحمتیں نازل فرمائے۔ آمین!

گوشۂ معلومات کے نتائج

محترم قارئین کرام! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

ہم نے ابتدا میں اعلان کیا تھا کہ "پیغام ثقلین" کے چاروں شماروں کے "گوشۂ معلومات" میں کم از کم ۹۰ فیصدی نمبر حاصل کرنے والوں کو شریکِ مقابلہ کیا جائے گا، چونکہ سال بھر کا وقفہ اور انتظار تھکا دینے والا ہوتا ہے لہٰذا قارئین کرام کی فرمائش کے مطابق دلچسپی برقرار رکھنے کے لیے اب ہر شمارہ کے نتائج کا اعلان آئندہ شمارہ میں کر دیا جائے گا۔

امید ہے آپ اس قیمتی مجلّہ کے فروغ کے لیے خاندان والوں، دوستوں نیز شناسا افراد کو ممبر بننے کی ترغیب دلائیں گے اور گوشۂ معلومات کے ذریعہ اپنی دینی معلومات میں اضافہ کے ساتھ انعام حاصل کریں گے۔ "ادارہ"

گوشۂ معلومات میں شرکت کرنے والوں کے نام حسب ذیل ہیں:

۱۔ جناب شوکت احمد ڈار، سجاد آباد سرینگر۔
۲۔ جناب ناصر علی شکار، سجاد آباد، سرینگر۔
۳۔ جناب شبیر حسین شکار، سجاد آباد، سرینگر۔
۴۔ جناب الطاف حسین ڈار، سجاد آباد سرینگر۔
۵۔ جناب شفقت محمد بٹ، باغوان پورہ سرینگر۔
۶۔ جناب عابد حسین بٹ، باغوان پورہ، سرینگر۔

انعام یافتگان کے نام:

۱۔ جناب انعام محمد سیکس سوار بھون، کلکتہ۔
۲۔ جناب میم حیدر کوری والے جلال پورہ، امبیڈکر نگر۔

جابر بن عبداللہ انصاری

جناب شیخ جعفر سبحانی

طلوعِ اسلام کے ابتدائی دن تھے، پیغمبر اسلام مکہ میں آئین اسلام کی تبلیغ میں مشغول تھے ان ہی دنوں موسم حج میں آپؐ قبیلۂ خزرج کے چھ افراد سے ملاقات کرتے ہیں اور انھیں دین اسلام کی دعوت دیتے ہیں۔ پیغمبر اسلامؐ کی تبلیغ نے ایسا اثر کیا کہ یہ لوگ اسی وقت ایمان لے آئے اور یہ وعدہ کیا کہ یثرب پہنچ کر لوگوں کو دین اسلام کے بارے میں بتائیں گے اور انھوں نے اپنا وعدہ نبھایا بھی۔ یثرب پہنچ کر یثرب کے باشندوں میں اسلام پھیلانے کی مسلسل کوششوں میں لگ گئے اور ان لوگوں تک اسلام کا پیغام پہنچایا۔

ان چھ افراد کی کوششیں کارگر ثابت ہوئیں اور یثرب کے کچھ لوگوں نے اسلام قبول کر لیا۔

بعثت کے بارہویں سال میں بارہ لوگوں کا ایک گروہ مدینہ سے مکہ کی طرف روانہ ہوتا ہے اور منیٰ کے پاس عقبہ نامی درہ میں پیغمبر اسلامؐ سے ملاقات کرتا ہے اور آپؐ کے ساتھ (دوستی) کا پیمان باندھتا ہے یہ اسلام کا سب سے پہلا معاہدہ ہے۔ یہ لوگ جن کے دل ایمان سے لبریز تھے مدینہ واپس لوٹ کر اسلام کی ترقی کے لیے اپنی کوششوں کو مزید تیز کر دیتے ہیں اور پیغمبر اسلامؐ کی خدمت میں خط بھیج کر یہ التماس کرتے ہیں کہ ان کے پاس ایک مبلغ بھیجا جائے جو انھیں قرآن کی تعلیم دے سکے۔

پیغمبر اسلامؐ نے مصعب بن عمیر کو آئین اسلام کی تعلیم کے لیے مدینہ روانہ فرمایا۔

مصعب با ایمان اور پُرجوش جوان تھے، مکہ کے ایک بڑے اور ثروتمند خاندان میں پرورش پائی تھی

جابر کا علم:

جابر نہ صرف یہ کہ راہ خدا میں میدان جنگ و جہاد کے سورما اور بزرگ شخصیت جانے جاتے تھے بلکہ علم و دانش و معارف الہٰی کے میدان میں بھی ممتاز شخصیتوں میں گنے جاتے تھے۔ جابر نے خاندان رسالت کے علوم و معارف سے بہت سے علوم سیکھے۔ ان کا سینہ علوم آل محمدؐ کا ایک سرشار خزانہ تھا۔

مورخین کا کہنا ہے کہ یہ ان افراد میں سے ہیں جنھوں نے پیغمبر اکرمؐ سے کثیر تعداد میں حدیثیں نقل کی ہیں۔[1]

جابر پیغمبر اکرمؐ کی حدیثیں نقل کرنے میں اس قدر مشہور اور معتبر سمجھے جاتے تھے کہ محمد بن سعد نقل کرتے ہیں کہ آپ ان قلیل افراد میں سے تھے جو عثمان کے قتل کے بعد مدینہ میں اسلامی مسائل کے بارے میں حدیث نقل کرتے تھے اور فتویٰ دیا کرتے تھے۔ خصوصاً پانچ افراد فتویٰ کے لیے مرجع مانے جاتے تھے ان میں سے ایک جابر بن عبداللہ تھے۔[2]

جابر مسجد نبوی میں درس دیا کرتے تھے۔ تشنگان علوم و دانش ان کے درس سے استفادہ کرتے تھے۔[3]

لہٰذا ہمیں اس بات پر تعجب نہیں ہونا چاہیے کہ امام باقر علیہ السلام بھی کبھی لوگوں کو متوجہ کرنے کی غرض سے جابر کی نقل کی ہوئی حدیثوں سے استناد کرتے تھے اور ان کی بنیاد پر فتویٰ دیا کرتے تھے۔

مثلاً جد کے ہوتے ہوئے بھائی کی اولاد کی وراثت کے سلسلہ میں امامؑ فرمایا کرتے تھے کہ جابر نے پیغمبر اکرمؐ سے نقل کیا ہے اور جابر ہرگز جھوٹ نہیں بولتے تھے کہ بھائی کی اولاد جد کے ساتھ میراث میں شریک ہے۔[4]

حاشیہ بقیہ صفحہ ۱۲۹: ۔ تعداد کے بارے میں نقل کی ہیں جن میں جابر شریک تھے۔

ابن سعد کہتے ہیں "شہد جابر بدراً و احداً و الخندق، و المشاہد کلہا مع رسول اللہؐ" جابر نے بدر و احد و خندق اور تمام جنگوں میں رسول اللہ کے ہمراہ شرکت کی ہے۔ الطبقات الکبریٰ ج ۳ / ۵۰۲

[1] احد المکثرین عن النبیؐ۔ الاصابہ ج ۱ / ۲۱۳۔ احد المکثرین الحفاظ للسنن۔ جابر کثیر حدیث نقل کرنے والے حافظوں میں سے ہیں اعیان الشیعہ ج ۱۵ / ۱۳۱ [2] حیاۃ الصحابہ ج ۳ / ۷۰۰، نقل از طبقات ابن سعد

[3] کان لجابر حلقۃ فی المسجد النبوی یوخذ عنہ العلم (اعیان الشیعہ جلد ۱۵ ص ۱۳۲)

[4] وسائل الشیعہ ج ۱۷ / ۴۸۴۔ کتاب ارث

البتہ امام باقر علیہ السلام جابر کی احادیث سے اس وجہ سے استناد کرتے تھے کہ اعتراض کرنے والوں کا منہ بند ہو جائے جو یہ کہتے ہیں کہ انھوں نے (امام باقر علیہ السلام) نے رسول اللہ کو جب دیکھا ہی نہیں ہے پھر وہ ان سے کس طرح حدیث نقل کر سکتے ہیں؟ بہرحال یہ مطالب امام باقر علیہ السلام کی نظر میں جابر کے معتبر و ثقہ ہونے اور بلند علمی مقام کی نشاندہی کرتے ہیں۔

ایک حدیث کے لیے طولانی سفر:

ظاہر سی بات ہے ایسے بلند علمی اور معنوی مقام تک پہنچنا کوئی آسان کام نہیں ہے اس کے لیے کوششوں، مستقل زحمتوں اور شدید جد وجہد کی ضرورت ہے، جابر جو اس مقام پر پہنچے ــــــ اور حقائق و معارف اسلامی کا علم حاصل کیا۔ یہ ان کے ذوق جستجو جذبہ اور غیر معمولی لگاؤ اور انتھک کوششوں کی بنا پر تھا۔

جابر نہ صرف یہ کہ رسول خدا کی زندگی میں حدیثوں کو حفظ اور انھیں نقل کرنے میں مصروف رہا کرتے تھے بلکہ آں حضرتؐ کی رحلت کے بعد بھی حدیثوں کو نقل کرنے اور اسلام کے گراں بہا آثار کو صحابہ کے ذریعہ پھیلانے کی کوشش میں لگے رہتے تھے۔ اگر انھیں معلوم ہوتا کہ کسی شخص نے پیغمبر سے کوئی حدیث سنی ہے جس کا علم انھیں نہیں ہے تو وہ ہر قیمت پر اس شخص کو ڈھونڈ نکالتے، تاکہ اس حدیث کو بلا واسطہ سن سکیں۔ کبھی کبھی تو اس غرض سے دور دراز کے سفر کی زحمت گوارا کرتے تھے۔ یہاں پر جابر کے سفروں میں سے دو نمونے پیش کیے جا رہے ہیں۔

جابر کہتے ہیں: مجھے معلوم ہوا کہ عبداللہ انیسؓ نے قصاص کے بارے میں پیغمبر سے حدیث سنی ہے۔ عبداللہ شام میں رہتے تھے میں نے اس حدیث کو ان سے سننے کے لیے ایک شتر خریدا اور شام کی طرف سفر پر روانہ ہو گیا۔ ایک مہینہ مسافت طے کرنے کے بعد شام پہنچا اور عبداللہ انیس کے گھر پہنچ کر دربان سے کہا جاؤ عبداللہ سے کہو کہ جابر دروازہ پر ٹھہرا ہے۔ دربان نے پوچھا۔ جابر بن عبداللہ؟ میں نے کہا ہاں۔

دربان اندر گھر میں گیا، کچھ ہی دیر کے بعد عبداللہ تیزی سے باہر آئے اور ہم دونوں ایک دوسرے سے بغل گیر ہو گئے اس وقت میں نے کہا۔

میں نے سنا ہے قصاص کے بارے میں پیغمبر اسلام سے ایک حدیث کی روایت کرتے ہو، مجھے خوف محسوس ہوا کہ اس حدیث کو سننے سے پہلے کہیں میں نہ مر جاؤں یا تم ہی اس دنیا سے چل بسو۔ اب میں وہ حدیث

تکوینی تسخیر:

تسخیر کی دوسری قسم تکوینی تسخیر ہے جو خداوند عالم کے تکوینی ارادہ کے ماتحت ہے، لیکن اس کا تعلق ہمارے نفع سے ہے۔ انسان کے کام آتی ہے لیکن اس کے ارادہ واختیار میں نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں سورۂ جاثیہ میں ارشاد ہوتا ہے:

وسخر لکم ما فی السمٰوٰت وما فی الارض [1]

اور اسی نے تمہارے لیے زمین وآسمان کی تمام چیزوں کو مسخر کر دیا ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ آسمان وزمین میں موجود تمام چیزیں ہمارے ارادہ واختیار کے تحت نہیں واقع ہوئی ہیں، بلکہ ان میں سے اکثر خداوند عالم کے تکوینی ارادہ کے تحت ہیں۔ چنانچہ سورۂ نحل میں آیا ہے:

وسخر لکم الیل والنھار والشمس والقمر والنجوم [2]

اور اسی نے تمہارے لیے رات دن اور آفتاب وماہتاب سب کو مسخر کر دیا ہے اور ستارے بھی اسی کے حکم کے تابع ہیں۔

اس بنا پر موجودات کی یہ قسم پروردگار عالم کے ارادہ ومشیت کے ذریعہ رواں دواں ہے، اور انسانوں کے لیے ان کی تسخیر کا معنی یہ ہے کہ یہ ان کے کام آرہے ہیں۔ ہم چاہیں یا نہ چاہیں، آفتاب و ماہتاب خدا کی مشیت سے اپنے مدار پر حرکت کرتے رہیں گے۔ شب وروز کی آمد ورفت ہمارے اختیار میں نہیں ہے لیکن وہ ہمارے فائدہ کے لیے ہے، کیونکہ اگر زمین ایک نقطہ کے اوپر ٹھہر جاتی تو جو حصہ آفتاب کے سامنے رہتا وہ تو بھٹی بن جاتا اور اس کی دوسری سمت منجمد ہو جاتی اور نتیجتاً دونوں سمتیں زندگی کے لیے نامناسب ہو جاتیں۔ لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ آفتاب وزمین ارادۂ پروردگار کے تحت کیونکر ہمارے فائدہ کے لیے حرکت میں ہیں اور کس طرح کرۂ ارض پر بسنے والے اس سے مستفید ہو رہے ہیں۔ لہٰذا سورۂ لقمان میں مذکور آیت "الم تروا ان اللہ سخر لکم ما فی السمٰوٰت وما فی الارض" تسخیر کی دونوں قسموں کو شامل ہے کیونکہ ان موجودات میں سے بعض مثلاً کشتی اور چوپائے انسان کی ارادی تسخیر کے تحت ہیں۔

---

[1] جاثیہ/۱۳۔ [2] نحل/۱۲۔

جابر کا علم:

جابر نہ صرف یہ کہ راہ خدا میں میدان جنگ و جہاد کے سورما اور بزرگ شخصیت جانے جاتے تھے بلکہ علم و دانش و معارف الٰہی کے میدان میں بھی ممتاز شخصیتوں میں گنے جاتے تھے۔ جابر نے خاندان رسالت کے علوم و معارف سے بہت سے علوم سیکھے۔ ان کا سینہ علوم آل محمدؑ کا ایک سرشار خزانہ تھا۔

مورخین کا کہنا ہے کہ یہ ان افراد میں سے ہیں جنھوں نے پیغمبر اکرمؐ سے کثیر تعداد میں حدیثیں نقل کی ہیں۔[۱]
جابر پیغمبر اکرمؐ کی حدیثیں نقل کرنے میں اس قدر مشہور اور معتبر سمجھے جاتے تھے کہ محمد بن سعد نقل کرتے ہیں کہ آپ ان قلیل افراد میں سے تھے جو عثمان کے قتل کے بعد مدینہ میں اسلامی مسائل کے بارے میں حدیث نقل کرتے تھے اور فتویٰ دیا کرتے تھے۔ خصوصاً پانچ افراد فتویٰ کے لیے مرجع مانے جاتے تھے ان میں سے ایک جابر بن عبداللہ تھے۔[۲]

جابر مسجد نبوی میں درس دیا کرتے تھے، تشنگان علوم و دانش ان کے درس سے استفادہ کرتے تھے۔[۳]
لہٰذا ہمیں اس بات پر تعجب نہیں ہونا چاہیے کہ امام باقر علیہ السلام بھی کبھی لوگوں کو متوجہ کرنے کی غرض سے جابر کی نقل کی ہوئی حدیثوں سے استناد کرتے تھے اور ان کی بنیاد پر فتویٰ دیا کرتے تھے۔
مثلاً جد کے ہوتے ہوئے بھائی کی اولاد کی وراثت کے سلسلہ میں امامؑ فرمایا کرتے تھے کہ جابر نے پیغمبر اکرمؐ سے نقل کیا ہے اور جابر ہرگز جھوٹ نہیں بولتے تھے کہ بھائی کی اولاد جد کے ساتھ میراث میں شریک ہے۔[۴]

حاشیہ بقیہ صفحہ ۱۳۹: ۱۔ تعداد کے بارے میں نقل کی ہیں جن میں جابر شریک تھے۔

ابن سعد کہتے ہیں "شہد جابر بدراً و احداً و الخندق، و المشاہد کلہا مع رسول اللہ"۔ جابر نے بدر و احد و خندق اور تمام جنگوں میں رسول اللہ کے ہمراہ شرکت کی ہے۔ الطبقات الکبریٰ ج ۳ / ۳ ۵۰

[۱] احد المکثرین عن النبیؐ۔ الاصابہ ج ۱ / ۲۱۳۔ احد المکثرین الحفاظ للسنن۔ جابر کثیر حدیث نقل کرنے والے حافظوں میں سے ہیں اعیان الشیعہ ج ۱۵ / ۱۳۱

[۲] حیاۃ الصحابہ ج ۳ / ۲۰۰، نقل از طبقات ابن سعد

[۳] کان لجابر حلقۃ فی المسجد النبوی یؤخذ عنہ العلم (اعیان الشیعہ جلد ۱۵ ص ۱۳۲)

[۴] وسائل الشیعہ ج ۱۷ / ۴۸۹، کتاب ارث

البتہ امام باقر علیہ السلام جابر کی احادیث سے اس وجہ سے استناد کرتے تھے کہ اعتراض کرنے والوں کا منہ بند ہو جائے جو یہ کہتے ہیں کہ انھوں نے (امام باقر علیہ السلام) نے رسول اللہ کو جب دیکھا ہی نہیں ہے پھر وہ ان سے کس طرح حدیث نقل کر سکتے ہیں؟ بہرحال یہ مطالب امام باقر علیہ السلام کی نظر میں جابر کے معتبر و ثقہ ہونے اور بلند علمی مقام کی نشاندہی کرتے ہیں۔

ایک حدیث کے لیے طولانی سفر:

ظاہر سی بات ہے ایسے بلند علمی اور معنوی مقام تک پہنچنا کوئی آسان کام نہیں ہے اس کے لیے کوششوں، مستقل زحمتوں اور شدید جد وجہد کی ضرورت ہے، جابر جو اس مقام پر پہنچے ـــــ اور حقائق و معارف اسلامی کا علم حاصل کیا۔ یہ ان کے ذوق جستجو جذبہ اور غیر معمولی لگاؤ اور انتھک کوششوں کی بنا پر تھا۔

جابر نہ صرف یہ کہ رسول خدا کی زندگی میں حدیثوں کو حفظ اور انھیں نقل کرنے میں مصروف رہا کرتے تھے بلکہ آں حضرتؐ کی رحلت کے بعد بھی حدیثوں کو نقل کرنے اور اسلام کے گراں بہا آثار کو صحابہ کے ذریعہ پھیلانے کی کوشش میں لگے رہتے تھے۔ اگر انھیں معلوم ہوتا کہ کسی شخص نے پیغمبر سے کوئی حدیث سنی ہے جس کا علم انھیں نہیں ہے تو وہ ہر قیمت پر اس شخص کو ڈھونڈ نکالتے، تاکہ اس حدیث کو بلا واسطہ سن سکیں۔ کبھی کبھی تو اس غرض سے دور دراز کے سفر کی زحمت گوارا کرتے تھے۔ یہاں پر جابر کے سفروں میں سے دو نمونے پیش کیے جا رہے ہیں۔

جابر کہتے ہیں: مجھے معلوم ہوا کہ عبداللہ انیس نے قصاص کے بارے میں پیغمبر سے حدیث سنی ہے۔ عبداللہ شام میں رہتے تھے میں نے اس حدیث کو ان سے سننے کے لیے ایک شتر خریدا اور شام کی طرف سفر پر روانہ ہو گیا۔ ایک مہینہ مسافت طے کرنے کے بعد شام پہنچا اور عبداللہ انیس کے گھر پہنچ کر دربان سے کہا جاؤ عبداللہ سے کہو کہ جابر دروازہ پر ٹھہرا ہے۔ دربان نے پوچھا۔ جابر بن عبداللہ؟ میں نے کہا ہاں۔

دربان اندر گھر میں گیا، کچھ ہی دیر کے بعد عبداللہ تیزی سے باہر آئے اور ہم دونوں ایک دوسرے سے بغل گیر ہو گئے، اس وقت میں نے کہا۔

میں نے سنا ہے قصاص کے بارے میں پیغمبر اسلامؐ سے ایک حدیث کی روایت کرتے ہو، مجھے خوف محسوس ہوا کہ اس حدیث کو سننے سے پہلے کہیں میں نہ مر جاؤں یا تم ہی اس دنیا سے چل بسو۔ اب میں وہ حدیث

سننے کے لیے آیا ہوں۔

عبداللہ نے کہا۔ پیغمبر اسلام نے فرمایا ہے۔ قیامت کے دن اللہ انسانوں کو میدان محشر میں برہنہ جمع کرے گا اس وقت بلند اور صاف آواز میں جس کو سب سن پائیں گے۔ مخاطب ہوگا میں دیان ہوں میں مالک ہوں، دوزخیوں میں سے اگر کسی کا حق کسی جنتی پر ہے تو وہ جہنم میں نہیں جائے گا مگر یہ کہ میں اسے اس کا حق دلوادوں۔

اور جنتیوں میں سے اگر کسی کا حق دوزخیوں میں سے کسی پر ہے تو جنت میں نہیں جائے گا۔ مگر یہ کہ میں اس کا حق دلوادوں، چاہے یہ حق، بے مورد اور ظالمانہ طمانچہ ہی کیوں نہ ہو۔

عبداللہ کہتے ہیں ہم نے رسول اللہؐ سے کہا۔ یہ کیسے ممکن ہے جب کہ خود آپ کا فرمان ہے کہ محشر میں لوگ برہنہ اور عریاں آئیں گے اور وہاں ان کے پاس کوئی چیز نہ ہوگی جس سے لوگوں کا حق ادا کر سکیں۔

حضرتؐ نے فرمایا وہاں قصاص اچھے برے اعمال کے ذریعہ ہوگا۔ یعنی انسان کے اچھے اعمال صاحب حق کو دے دیے جائیں گے اور اگر اس کے پاس کوئی اچھے اعمال ہوں ہی نہیں تو صاحب حق کے برے اعمال اس کے نامۂ اعمال میں اضافہ کر دیے جائیں گے۔[۱]

• مسلمہ بن مخلد کہتے ہیں کہ مصر میں اپنے گھر میں بیٹھا ہوا تھا۔ دربان آکر کہتا ہے، ایک عرب شتر سوار دروازہ پر کھڑا ہوا ہے اور ملاقات کی اجازت چاہتا ہے، میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ وہ جابر بن عبداللہ انصاری ہیں۔

مسلمہ کہتے ہیں۔ میں نے کھڑکی سے سر باہر نکال کر کہا میں نیچے آؤں یا آپ اوپر آئیں گے؟

جابر نے کہا نہ میں اوپر آؤں گا نہ آپ نیچے میں نے سنا ہے کہ مسلمانوں کے عیوب کی پردہ پوشی کی فضیلت میں آپ رسول اللہؐ سے حدیث نقل کرتے ہیں میں وہ حدیث سننے کی غرض سے آیا ہوں۔

مسلمہ کہتے ہیں۔ میں نے ان سے حدیث بیان کر دی کہ رسول خداؐ فرماتے ہیں:

"جس نے کسی مومن کا عیب چھپایا گویا اس نے زندہ دفن شدہ انسان کو موت کے چنگل سے نجات دلادی"[۲]

۱؎ حیاۃ الصحابہ ج ۲/ ۶۹۶، مستدرک حاکم ج ۲/ ۴۳۵، مؤلف حیاۃ الصحابہ نے اس حدیث کو الادب المفرد، مسند ابو یعلی، فتح الباری فی شرح البخاری ج ۱/ ۱۰۰، جامع بیان العلم ج ۱/ ۹۲ اور چند دوسری کتابوں سے نقل کیا ہے

۲؎ حیاۃ الصحابہ ج ۲/ ۹۹ (من ستر علی مومن عورۃ فکانما احیا موؤدۃ)

جابر نے جو احادیث پیغمبرؐ اور آل پیغمبرؐ سے نقل کی ہیں وہ صرف ان احادیث میں ہی منحصر نہیں ہیں۔ جابر چوں کہ ہمیشہ مختلف مقامات پر رسول اکرمؐ کے حضور سے استفادہ کرتے رہتے تھے اور آں حضرتؐ کے ہمراہ اکثر جنگوں میں بھی شریک تھے اس لیے رسول اکرمؐ کی سیرۃ کا ایک بڑا حصہ نقل کیا ہے جو کہ سیرۃ اور تاریخ کی کتب میں موجود ہے۔ [1]

اس کے علاوہ جابر نے ائمہ اہل بیتؑ سے بھی بہت زیادہ روایتیں نقل کی ہیں کیوں کہ آپ ہمیشہ اہلبیتؑ عصمت کے دامن سے متمسک رہے۔

جابر اور شفاعت:

ان تمام امور کے علاوہ جابر سے مسئلہ شفاعت کے سلسلے میں ایسی حدیثیں نقل ہوئی ہیں جن سے معارف اسلامی کے درک کرنے میں جابر کے شامخ مقام و اعلیٰ منزلت کا پتہ چلتا ہے۔

شفاعت، دین اسلام کا ایک مسلّم اصول ہے جس کو قرآن مجید اور احادیث نے ایک مسلّم الثبوت سنت الہٰی کے طور پر بیان کیا ہے اور علماء اسلام نے اپنی کتب تفسیر و حدیث میں اس مسئلہ پر بحث و گفتگو کی ہے۔

اس کے باوجود کچھ لوگ اسلامی شفاعت کے سلسلہ میں شک و شبہ میں گرفتار ہیں۔ اور عوام کو گناہ سے باز رکھنے کے سلسلہ میں اس کے قوی اثرات کو نظرانداز کرتے ہیں۔

بعض اوقات کچھ علماء صرف آیات عذاب سے تمسک کرتے ہیں اور ہمیشہ لوگوں کو ڈراتے دھمکاتے رہتے ہیں اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کے دل میں خدا کی طرف سے مغفرت اور بخشش کی کوئی امید باقی نہیں رہتی۔ یہ علماء اس نکتے سے غافل ہیں کہ اگر خوف و بیم تربیت و ارتقاء کے بنیادی ارکان میں سے ہیں تو امید و حسن ظن کا بھی یہی درجہ ہے۔ اگر عذاب کا ڈر اور خدا کی طرف سے معین کی ہوئی سزاؤں کا خوف انسان کو گناہ و لغزش سے روکتا ہے تو بخشش کی امید بھی انسان کے دل و دماغ کو روشن کرتی ہے اور نیکی کی طرف حرکت کا باعث ہوتی ہے اور گنہ گاروں کو راہ معصیت سے واپس لانے کا کام کرتی ہے۔

ڈرانا دھمکانا اس حد تک اچھا ہے کہ وہ امید کے رشتہ کو قطع نہ کر دے ورنہ بدبختی اور نقصان کا موجب

---

[1] شفاً حیاۃ الصحابہ کے مؤلف اپنی چار جلدی کتاب میں مختلف موضوعات کے ذیل میں جابر کی احادیث ذکر کرتے ہیں۔

ہو سکتا ہے۔

ایک ماہر نفسیات امید کی اہمیت اور ناامیدی کے شدید نقصانات کے سلسلے میں لکھتا ہے:

بہت سے لوگ جہالت کی بنا پر مذہب کے انسان نواز اور محبت سے لبریز اصولوں پر توجہ کیے بغیر اسقدر سختی سے کام لیتے ہیں کہ ان کی ساری توجہ مذہب کے آمرانہ پہلوؤں اور عذاب و سزا کے امور پر مرکوز ہو جاتی ہے۔ یہ لوگ دراصل بھول جاتے ہیں کہ خدا نے اگر دوزخ بنایا ہے تو جنت بھی بنائی ہے۔ یہ لوگ عدالت خداوندی اور عفو و بخشش الٰہی کو عمداً یا نادانستہ طور پر بھلا بیٹھتے ہیں اور اپنے پروردگار کے بارے میں غلط خیالات میں گرفتار ہو جاتے ہیں گویا خدا کا کام صرف بندوں کو ہر چھوٹے بڑے گناہ کے سبب سزا دینا اور عذاب میں مبتلا کرنا ہے۔ خدا و مذہب کے احکام کے بارے میں اس طرح کے غلط تصورات انسان کے وجود کو دوزخ میں تبدیل کر دیتے ہیں اور وہ لمحہ لمحہ اپنے آپ کو اس میں جلتا ہوا محسوس کرتا ہے۔ اور وہ اذیت ناک احساس کا شکار ہو جاتا ہے۔ اسی وجہ سے ہمیں چاہیے کہ ہم اپنے بچوں کی تربیت اس طرح سے کریں کہ سب سے پہلے ان کے دلوں میں مذہب کے جنتی پہلو کو اجاگر اور راسخ کریں۔ اور انھیں بلا وجہ مذہب اور خدا سے نہ ڈرائیں۔

درحقیقت بات بھی یہی ہے کہ خدا کے سارے بندے جنت میں جائیں گے علاوہ ان لوگوں کے جنھوں نے گناہ کبیرہ کیے ہیں اور توبہ کی فرصت نیز نقصان کی تلافی کے وقت سے فائدہ نہیں اٹھایا۔

اگر سزا کا تصور ہے تو اسی کے ساتھ ساتھ عفو و بخشش بھی ہے اگر ہم اپنی نوجوان نسل سے یہ کہتے رہیں کہ تم لوگ گناہ و خطا کرنے کے نتیجہ میں جنت میں نہیں جاؤ گے تو ہماری یہ نسل اس غلط نتیجہ پر پہنچے گی کہ اس نے جو گناہ کیے ہیں ان کی وجہ سے وہ کسی کام کی نہیں ہے اب چاہے وہ کچھ بھی کریں خدا انھیں معاف نہیں کر سکتا۔ لہٰذا ہو سکتا ہے یہ لوگ ہر طرح کے احساس ذمہ داری کو بالائے طاق رکھ دیں اور ناامیدی کی بنا پر ایسا اقدام کر بیٹھیں جو ان کے حق میں نہایت مضر ثابت ہو۔ وہ لوگ جو مذہب کے حقیقی چہرہ کو دگرگوں کر کے جوانوں میں اصلاح و توبہ اور برے کاموں پر نادم ہونے کے دروازے بند کر دیتے ہیں درحقیقت دربار گاہ خداوندی کی توہین کرتے ہیں کیوں کہ ہمارے مذہب حقہ میں بہشت کا دروازہ توبہ کرنے والوں پر ہمیشہ کھلا ہے۔

جابر کا مناظرہ:

شفاعت کے بارے میں جابر سے جو حدیث نقل ہوئی ہے وہ اس طرح ہے:

طلق بن حبیب کہتے ہیں:

میں شفاعت کے سخت ترین منکروں میں سے تھا اور شفاعت کی تکذیب کیا کرتا تھا۔ جب میری ملاقات جابر سے ہوئی تو میں نے انھیں وہ آیات سنائیں جن میں عذاب کو جاودانی بتایا گیا ہے میں نے ان آیتوں سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ آیت کے مطابق اہل دوزخ جہنم کی آگ میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رہیں گے۔

اس وقت جابر نے میری طرف رخ کیا اور کہا: کیا تم تصور کرتے ہو کہ مجھ سے زیادہ کتاب خدا اور سنت پیغمبرؐ کا علم رکھتے ہو؟ تم نے جو آیتیں پڑھی ہیں ان میں دائمی عذاب کا ذکر ضرور ہے لیکن یہ عذاب مشرکین اور بت پرستوں سے مخصوص ہے، اور شفاعت ان مومنوں کے لیے ہے جو لغزش و گناہ میں ملوث ہو جاتے ہیں اور جہنم میں اپنے کیے کی سزا کاٹنے کے بعد، شفاعت کے ذریعہ وہاں سے خلاصی پاتے ہیں۔

اس کے بعد جابر اپنے کانوں کی طرف اشارہ کر کے کہتے ہیں۔

"یہ بہرے ہو جائیں اگر میں نے پیغمبرؐ سے یہ بات نہ سنی ہو، میں نے اپنے ان دونوں کانوں سے پیغمبر اکرمؐ کو کہتے سنا ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

"گنہگاروں میں سے کچھ لوگ جہنم میں جانے کے بعد وہاں سے باہر آئیں گے۔"

دوزخیوں کے بارے میں جو آیات ہیں، جابر نے انھیں دو حصوں میں بانٹا ہے۔ جن آیتوں میں دائمی و ابدی عذاب کا ذکر کیا گیا ہے ان کو مشرکین اور بت پرستوں سے مخصوص بتایا ہے اور دوسرے حصے کو گنہگار مومنین کے متعلق بتایا ہے۔ اس امر سے قرآن کی تفسیر کے سلسلہ میں جابر کی منزلت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ صرف یہی ایک مورد نہیں ہے جس میں جابر نے لوگوں کو قرآنی معارف سے آشنا کرایا ہے۔ بلکہ کتب احادیث سے استفادہ ہوتا ہے کہ انھوں نے مجمع عام میں ایک محدث سے شفاعت کے بارے میں مناظرہ کر کے اسے زیر کیا۔ یہ مناظرہ حسب ذیل ہے۔

"یزید فقیر" کہتے ہیں کہ وہ جابر کے پاس بیٹھے ہوئے تھے جابر لوگوں کو پیغمبر اسلام کی حدیثیں سنا رہے تھے۔ انھوں نے اپنے کلام کے ضمن میں یہ جملہ بھی کہا: جہنم کی آگ سے کچھ لوگ آزاد ہو جائیں گے۔

مجھے اس جملے سے سخت تکلیف پہنچی میں نے جابر سے کہا: مجھے دوسروں سے تو تعجب نہیں لیکن تم صحابہ محمدؐ کی باتوں پر تعجب ہوتا ہے کہ تم کہتے ہو جہنم کی آگ سے بعض لوگ آزاد کر دیے جائیں گے۔ جب کہ یہ قول خدا کے کلام سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ خدا قرآن میں فرماتا ہے۔ یریدون ان یخرجوا من النار وماھم بخارجین

منھا۔ (مائدہ/۳۷)

"یہ لوگ چاہتے ہیں کہ جہنم سے نکل جائیں حالاں کہ یہ نکلنے والے نہیں ہیں اور ان کے لیے ایک مستقل عذاب ہے۔

میں نے جب یہ بات کہی تو لوگوں نے میری سرزنش کی لیکن جابر نے کمال بردباری اور بڑے آرام سے حاضرین سے کہا کہ ان کو ان کے حال پر چھوڑ دو تاکہ میں ان کے لیے اس مطلب کی وضاحت کر دوں پھر فرمایا: یہ آیت جو تم نے تلاوت کی ہے اس میں جہنم میں ہمیشہ ہمیشہ رہنے کا حکم مشرکین اور بت پرستوں سے متعلق ہے اور بطور کلی کافروں کے لیے نازل ہوئی ہے یہ آیت اس طرح ہے۔

ان الذین کفروا لو ان لھم ما فی الارض جمیعا و مثلہ معہ لیفتدوا بہ من عذاب یوم القیامۃ ما تقبل منھم و لھم عذاب مقیم۔ (مائدہ/۳۶-۳۷)

یقیناً جن لوگوں نے کفر اختیار کیا اگر ان کے پاس ساری زمین کا سرمایہ ہو اور اتنا ہی اور شامل کر دیں کہ روز قیامت کے عذاب کا بدلہ ہو جائے تو یہ معاوضہ قبول نہ کیا جائے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہوگا۔ یہ لوگ جہنم سے نکلنا چاہتے ہیں حالاں کہ یہ نکل نہیں سکتے اور ان کے لیے مستقل ودائمی عذاب ہے۔

جابر نے یہ دو آیتیں پڑھنے کے بعد میری طرف رخ کر کے پوچھا کیا تم قرآن کی تلاوت کرتے ہو۔ میں نے کہا میں نے قرآن حفظ کیا ہے۔

اس بات پر جابر نے مجھے اس آیہ کی یاددہانی کرائی جس میں خدا نے اپنے پیغمبر کو مقام محمود کی بشارت دی ہے۔

آیت یہ ہے: و من اللیل فتھجد بہ نافلۃ لک عسی ان یبعثک ربک مقاما محمودا۔ (اسراء/۷۹)

اور رات کے ایک حصہ میں قرآن کی تلاوت اور نماز و عبادت میں مشغول رہتے ہوئے بیدار رہیں یہ آپ کے لیے اضافہ خیر ہے عنقریب آپ کا پروردگار آپ کو مقام محمود تک پہنچا دے گا۔

جابر نے کہا یہ مقام محمود وہی مقام شفاعت ہے (یعنی آپ کو شفاعت کرنے کا حق حاصل ہوگا) جس کے بارے میں قرآن کا ارشاد ہے۔ یہ شفاعت ان لوگوں کے لیے ہے جو گناہ کرنے کی وجہ سے جہنم میں جائیں گے اور اللہ ان سے ہرگز مخاطب نہ ہوگا اور جب اس کا ارادہ ہوگا وہ انھیں جہنم سے رہا کر دے گا۔

یزید فقیر کہتے ہیں، میں نے جابر کے بیانات سننے کے بعد پھر کبھی شفاعت کا انکار نہیں کیا۔[۱]

[۱] صحاح السنۃ ۲/۲۷۱، نقل از تفسیر ابن کثیر ۲/۵۲

یہاں پر مناسب ہو گا کہ جو حدیث امیرالمومنین علیہ السلام سے شفاعت کے بارے میں نقل ہوئی ہے ذکر کی جائے۔ یہ حدیث جابر کے نظریہ کی واضح طور پر تائید کرتی ہے۔

امیرالمومنین علیہ السلام پیغمبر اکرمؐ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: میں اپنی امت کے بارے میں اس قدر شفاعت کروں گا کہ ندا پروردگار آئے گی۔ اے محمدؐ کیا تم راضی ہو گئے۔ میں کہوں گا میں راضی ہو گیا۔

امیرالمومنین علیہ السلام اس حدیث کو بیان کرنے کے بعد عراق کے لوگوں سے کہتے ہیں۔ اہل عراق کیا تم لوگ تصور کرتے ہو کہ قرآن میں سب سے زیادہ امید دلانے والی آیۃ "یاعبادی الذین اسرفوا علی انفسھم لاتقنطوا من رحمۃ اللہ ان اللہ یغفر الذنوب جمیعا انہ ھوالغفور رحیم (زمر/۵۳) ہے؟

("پیغمبر آپ پیغام پہنچادیجیے کہ) اے میرے وہ بندے جنھوں نے اپنے نفس پر زیادتی کی ہے رحمت خدا سے مایوس نہ ہونا اللہ تمام گناہوں کا معاف کرنے والا ہے اور وہ یقیناً بہت زیادہ بخشنے والا اور مہربان ہے۔

لیکن ہم اہل بیت پیغمبر یہ کہتے ہیں کہ سب سے زیادہ امید دلانے والی آیۃ یہ ہے ولسوف یعطیک ربک فترضیٰ (ضحیٰ/۵)

اور عنقریب تمہارا پروردگار تمہیں اس قدر عطا کر دے گا کہ خوش ہو جاؤ گے۔ اس آیۃ میں پیغمبرؐ کو عطا کیے جانے والے جس امر کی طرف اشارہ ہے یہ مقام وحق شفاعت ہے۔[1]

ضروری تذکر:

شفاعت کے سلسلے میں ایک اہم نکتہ کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ شفاعت پر اعتقاد صرف اس صورت میں مفید اور موثر ہو سکتا ہے جب وہ ہر طرح کی عوام فریبی اور مکر و حیلہ سے دور اور منزہ ہو وہ شفاعت جس کی طرف قرآن و حدیث و عقل، دعوت دیتی ہے اس شفاعت سے جدا ہے جو بعض لوگوں کے اذہان میں موجود ہے۔ ان دونوں میں فرق کرنا بہت ضروری ہے۔

---

[1] حیاۃ الصحابہ ج ۳ ص ۴۳۷ بنقل از کنز العمال ۵/۲۰۳

جاہل و ناآگاہ لوگوں کی طرف سے شفاعت کی غلط تفسیر ہمیں شفاعت کی اصل حقیقت کو درک کرنے سے باز رکھتی ہے اور انسان کو حاجب نامی شاعر کے شعر کی یاد دلانے لگتی ہے جو یہ سمجھتا تھا کہ قیامت کے دن علی علیہ السلام اپنے سارے شیعوں کی شفاعت کریں گے۔

لہٰذا اس طرف سے مطمئن ہو کر ان کے شیعہ ہر قسم کے گناہ کر سکتے ہیں!!!

اسی بنا پر اس نے امام کی شان میں ایک قصیدہ لکھا جس کا مطلع یہ ہے۔

حاجب اگر معاملہ حشر با علیؑ است

من ضامنم تو ہر چہ بخواہی گناہ کن

اس شعر کا مطلب یہ ہے کہ حاجب، جب حشر کا معاملہ علیؑ کے ہاتھ میں ہے یعنی وہ اپنے شیعوں کو بلا حساب و کتاب جنت میں بھیج دیں گے تو ڈر کس بات کا۔ تمہارے جنت میں جانے کی ضمانت لیتا ہوں تم جتنا اور جیسا چاہو گناہ کرو۔

لیکن اسی شاعر کا کہنا ہے کہ اس نے خواب میں امامؑ کو دیکھا کہ آپ اس طرح کے خرافاتی اشعار کہنے پر شاعر سے ناراض اور اس پر غصہ ہیں۔

امامؑ نے شاعر سے کہا کہ وہ اپنے شعر میں دوسرے مصرع کو اس طرح بدل دے

حاجب اگر معاملہ حشر با علیؑ است

شرم از رخ علی کن کمتر گناہ کن

اے حاجب جب معاملہ محشر کا حضرت علیؑ کے ہاتھ میں ہے تو تم ان سے شرم کرو اور بہت کم گناہ کرو

خواہ یہ واقعہ کوئی حقیقت رکھتا ہو یا محض افسانہ ہو شفاعت کے بارے میں صحیح یہی ہے جو اس واقعہ میں بیان ہوا ہے (یعنی شفاعت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم بے مہار ہو جائیں اور شفاعت کی امید پر اپنے آپ کو گناہ و معصیت کے کیچڑ زار میں آلودہ کر لیں۔)

مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ دین کے معارف اور مسائل کو محقق عالموں سے اور اسلام کی اصل کتابوں سے اخذ کریں تاکہ وہ حقیقی شفاعت اور بے بنیاد شفاعت میں امتیاز پیدا کر سکیں۔ مکر و فریب میں پھنسانے والے درویش نما قصہ کہانی سنانے والے پیشہ ور نما عامیانہ اور بے بنیاد کتابیں جو بے صلاحیت افراد نے لکھی ہیں۔

ان پر بھروسہ نہ کریں۔

خاندان رسالت سے قربت:

جابر پیغمبر اکرمؐ کے ان قلیل اصحاب میں سے ہیں جو شیعوں کے نزدیک خاص محبوبیت اور شہرت رکھتے ہیں اور شیعہ عوام میں ایک جانی پہچانی شخصیت ہیں۔ کیوں کہ اہل بیتؑ سے آپ کا ارتباط اور معنوی رشتہ بڑا گہرا تھا۔ جابر ہمیشہ اہل بیتؑ کے دامن سے متمسک رہے اور ہر دشوار گزار مرحلہ میں آپ نے اہل بیتؑ کا ساتھ دیکر اس گہرے رشتہ کا ثبوت دیا ہے۔

امام صادق علیہ السلام ایک تفصیلی حدیث کے ضمن میں فرماتے ہیں:

جابرؒ ہم اہل بیتؑ کی نسبت وفادار اور صمیمی تھے۔[1]

جابر پیغمبر اکرمؐ کی رحلت کے بعد ہمیشہ خاندان رسالت کے ساتھ رہے حضرت علیؑ جب معاویہ کی طغیانی اور بغاوت کی سرکوبی میں مصروف تھے جابر آپ کے ہمراہ تھے اور جنگ صفین میں آپ کی رکاب میں تھے۔[2]

ان باتوں کے علاوہ۔ جابر کا کربلا میں امام حسین علیہ السلام کی زیارت کے لیے آنا ان کو امر کر گیا جبتک سید الشہداء کا نام زندہ ہے جابر کا نام بھی اس مقدس نام کی ضوفشانیوں کے سبب جلوہ گر رہے گا اسی وجہ سے بہت سی دینی محفلوں اور مجلسوں میں جابر کا نام امام حسینؑ کے نام کے ساتھ لیا جاتا ہے (اس سلسلے میں آئندہ گفتگو ہوگی)

خاندان رسالت سے جابر کی خاص محبت کو واضح اور روشن کرنے کے لیے مناسب ہوگا کہ تفسیر نور الثقلین کی ایک حدیث کا ذکر کیا جائے یہ حدیث اس طرح سے ہے۔

امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں۔ جب یہ آیۃ "قل لا اسئلکم علیہ اجراً الا المودۃ فی القربیٰ"[3] آپ کہہ دیجئے کہ میں تم سے اس تبلیغ رسالت کا کوئی اجر نہیں چاہتا علاوہ اس کے کہ میرے اقرباء سے محبت کرو" نازل ہوئی تو رسول اللہؐ نے مسلمانوں سے فرمایا:

---

[1] کان رجلا منقطعا الینا اہل البیت۔ کشی ۴۲/۱۰ اس مطلب کو مامقانی نے دوسرے طریقوں سے نقل کیا ہے (رجال مامقانی ج۱ ۱۹۹/)

[2] اعیان الشیعہ ج ۱۵ ۱۳۹/ ، اسد الغابہ ج ۱ ۲۵۶/ [3] شوریٰ ۲۳/

اور بعض دوسرے موجودات مثلاً اجرام فلکی اور زمین کے کچھ موجودات صرف خدا کے تکوینی ارادہ کے پابند ہیں. پس اس آیۂ کریمہ میں تسخیر کی دونوں قسمیں بیان ہوئی ہیں لیکن چونکہ دونوں انسانی فائدہ کے لیے ہیں لہٰذا اسے لام منفعت (لکم) کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے.

نعمتوں میں وسعت :

واسبغ علیکم نعمہ ظاھرۃ وباطنۃ - "اسباغ" کے معنی بہت زیادہ وسعت و فراوانی کے ہیں۔ خداوند عالم نے اپنی ظاہری اور باطنی نعمتوں کو تمہارے لیے وسعت دی ہے اور اس میں اضافہ کیا ہے۔ اور یہ نعمتیں دو طرح کی ہیں۔ ۱۔ ظاہری نعمتیں ۲۔ باطنی نعمتیں۔ ظاہری نعمتیں وہ ہیں، جنھیں انسان اپنے ظاہری حواس مثلاً آنکھ، کان اور دوسرے پنجگانہ حواس سے محسوس کر سکتا اور ان سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ انسان ان حواس کے ذریعہ دنیا کے موجودات مثلاً دکھائی دینے والی، سنائی دینے والی، سونگھی جانے والی، چکھی جانے والی، اور چھوئی جانے والی چیزیں جو اللہ کی ظاہری نعمتیں ہیں انھیں درک کرتا ہے۔

لیکن باطنی نعمتیں ان حواس کے ذریعہ درک نہیں ہوتیں، بلکہ غور و فکر اور باطنی حواس کے ذریعہ انھیں محسوس کیا جا سکتا ہے۔ باطنی حواس قوتِ حافظہ، قوتِ متخیلہ، قوتِ واہمہ اور قوتِ عاقلہ سے عبارت ہے۔ اور ہم دیکھتے ہیں کہ انسانی دماغ مختلف قوتوں کا حامل ہوتا ہے، اس سلسلہ میں ارسطو کہتے ہیں:

"یہ جان لو کہ آدمی کے پاس ایک قوت ہے جسے دماغ کہا جاتا ہے. جس میں اشیاء کی صورت ویسے ہی ابھر کر سامنے آتی ہے جس طرح آئینہ میں ابھرتی ہے."

علم و دانش، آسمانی کتابیں اور بشری ہدایت کے منصوبے خدا کی طرف سے پیغمبروں پر نازل کرنے والے فرشتے اور وہ ملائکہ جو انسانوں کو شیاطین کے شر سے محفوظ رکھتے ہیں اور امورِ کائنات کی دیکھ بھال کرنے والے ہیں، یہ سب باطنی نعمت شمار ہوتے ہیں جو ظاہری قوتوں کے ذریعہ محسوس نہیں کیے جاتے لیکن باطنی قوت کے ذریعہ ان کا وجود محسوس کیا جاتا ہے۔ خداوند عالم نے اس مختصر جملہ، واسبغ علیکم نعمہ ظاھرۃ وباطنۃ ، کے ذریعہ ان نعمتوں کی طرف اشارہ فرمایا ہے یعنی ہر وہ نعمت جسے فکرِ بشر

"لوگو! خدا نے تمہارے ذمہ میرا ایک حق رکھا ہے۔ کیا تم لوگ میرا حق ادا کرسکو گے؟"

کسی نے کوئی جواب نہیں دیا اور یہ دن گزر گیا۔

دوسرے دن بھی پیغمبر گزشتہ روز کی طرح لوگوں کے درمیان کھڑے ہوئے اور کل والی باتیں دہرائیں لیکن دوسرے دن بھی کسی نے کوئی جواب نہیں دیا۔

تیسرے دن بھی ان ہی باتوں کو دہرایا کسی کا جواب نہ پاکر پیغمبر اسلامؐ نے کہا جس حق کے بارے میں نے کہا ہے نہ وہ سونا ہے نہ چاندی نہ کھانے پینے کی چیزوں میں سے ہے۔

اس وقت بعض لوگوں نے پوچھا پس وہ حق کیا ہے؟

آپ نے فرمایا: خدا نے میرے اوپر یہ آیت نازل کی ہے۔

قل لا اسئلکم علیہ اجرا الا المودۃ فی القربیٰ "آپ کہہ دیجئے کہ میں تم سے اس تبلیغ رسالت کا کوئی اجر نہیں چاہتا۔ علاوہ اس کے کہ میرے اقرباء سے محبت کرو۔

مسلمانوں نے کہا اگر ہمارے ذمہ آپ کا حق آپ کے خاندان سے دوستی اور محبت ہے تو کوئی بات نہیں ہمیں قبول ہے۔

امام صادق علیہ السلام اس کے بعد بیان کرتے ہیں۔

سات افراد کے علاوہ کوئی بھی اس آیت کا یعنی عہد و پیمان کا وفادار نہ تھا۔ اور سات افراد یہ ہیں۔ سلمانؓ ابوذرؓ عمارؓ مقدادؓ جابر بن عبداللہ انصاری، ایک پیغمبرؐ کا آزاد کردہ غلام ثبت یا ثبیت و زید ابن ارقم۔[۱]

بے شک جابر نے اس آیت کے مضمون کے ساتھ وفاداری کی ہے اور خاندان رسالتؐ کا دفاع کرنے اور ان کے فضائل بیان کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔

ابوزبیر کہتے ہیں: جابر عصا کے سہارے گلیوں میں اور انصار کی بزموں میں گھوم گھوم کر یہ کہا کرتے تھے۔ علیؑ سب سے بہترین انسان ہیں اور جو بھی اس کا انکار کرے اس نے حق کشی کی، اس کے بعد کہا کرتے تھے۔ اے گروہ انصار، اپنے بچوں کی تربیت علیؑ کی محبت پر کرو۔[۲]

[۱] تفسیر نور الثقلین ج ۴ ص ۵۰۰ بنقل از قرب الاسناد حمیری [۲] علی خیر البشر فمن ابی فقد کفر (ای ستر الحق) یا معاشر الانصار ادبوا اولادکم علی حب علی۔ رجال کشی ص ۴۲

ابوزبیر کہتے ہیں:

میں نے جابر سے پوچھا علیؑ کیسے شخص تھے؟ جابر نے اپنی بھنویں سمیٹیں جو آنکھوں پر آ گئی تھیں اور کہا علیؑ روئے زمین پر موجود تمام انسانوں سے بہتر تھے۔ ہم لوگ رسول اللہؐ کے زمانے میں منافقین کو علیؑ کی دشمنی سے پہچانتے تھے[1]۔

جابر سے حضرت علیؑ کے خلاف جنگ کے بارے میں پوچھا گیا! انھوں نے کہا علیؑ سے لڑنا حرام ہے' اس بات میں کافر کے علاوہ کوئی شک نہیں کرتا[2]۔

جابر اس گروہ کی پہلی فرد تھے جو پیغمبر اسلامؐ کی رحلت کے بعد حضرت علیؑ سے ملحق ہوا اور آپؑ کے ساتھ کیے گئے عہد و پیمان پر باقی رہا[3]۔

جابر کا حضرت علیؑ کی طرف رجحان بلا دلیل نہیں تھا وہ خود مشہور حدیث غدیر اور حدیثِ منزلت کے راوی ہیں[4]۔ یہ دونوں حدیثیں اہل سنت کی معتبر کتب میں مختلف طریقوں سے مروی ہیں۔

حدیث منزلت یہ ہے:

"جابر کہتے ہیں پیغمبر اسلامؐ نے علیؑ سے فرمایا: کیا تم اس بات سے خوش نہیں ہو کہ تمہیں مجھ سے وہی نسبت ہے جو ہارونؑ کو موسیٰؑ سے تھی بس فرق یہ کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا[5]۔

---

[1] رجال کشی ۴۱/۱ یہی مضمون تاریخ ابن عساکر ج ۲/ ۴۳۲ پر بھی نقل ہوا ہے۔ [2] تاریخ ابن عساکر ج ۳ صفحہ ۲۲۲ اس کتاب کے فاضل تاریخ نے اس حصہ کے حاشیہ میں اسی مضمون کی ایک اور حدیث خطیب کی کتاب فی المتفق والمتفرق ج ۱۵/ ۱۲۳ سے اس طرح نقل کی ہے۔

عبداللہ بن ابی الجعد کہتے ہیں ہم لوگ جابر کے پاس بیٹھے ہوئے تھے باتوں باتوں میں حضرت علیؑ کا ذکر نکل آیا جابر نے آپؑ کے درخشاں فضائل بیان کرنے شروع کر دیے۔ حاضرین میں سے ایک شخص نے حضرت علیؑ کے بارے میں اہانت آمیز جملہ کہا۔ جابر نے جب یہ سنا تو اپنی بھنووں کو سمیٹا اور اس کی طرف رخ کر کے کہا کیا تم علیؑ کی عظمت کے بارے میں شک کرتے ہو وہ ان کے سلسلے میں کافر کے علاوہ کوئی شک نہیں کرتا۔

[3] انه من السابقين الذين رجعوا الى امير المومنين۔ یہ حضرت علیؑ کی طرف آنے والے افراد میں پیش پیش تھے۔ رجال ماتقانی ج ۱/ ۱۹۹۔ قاموس الرجال ج ۲/ ۳۱۳۔ رجال کشی ۳۷۔ سفینۃ البحار ج ۱/ ۳۱ [4] تاریخ ابن عساکر ج ۲/ ۶۰

[5] تاریخ ابن عساکر ج ۱/ ۳۶

امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

امام حسینؑ کی شہادت کے بعد ابو خالد کابلی یحییٰ بن ام طویل جبیر بن مطعم و جابر بن عبداللہ انصاری کے علاوہ تمام لوگوں نے خاندان اہل بیتؑ سے روگردانی کی۔ پھر دھیرے دھیرے دیگر افراد بھی ان لوگوں کے حلقہ میں شامل ہوتے رہے اور خاندان رسالت کے چاہنے والوں کی تعداد بڑھتی گئی۔[1]

جابر کہتے ہیں ایک دن پیغمبرؐ کی خدمت میں شرفیاب ہو کر عرض کیا کہ آپ کا جانشین اور وصی کون ہے؟

پیغمبرؐ نے قدرے سکوت کیا اور میرا جواب نہیں دیا۔ پھر فرمایا کیا تمہارے سوال کا جواب دوں؟

میں نے عرض کیا، جی! لیکن چوں کہ آپ خاموش ہو گئے تھے اس لیے میں نے سوچا کہ میرے سوال سے آپ ناخوش ہو گئے ہیں۔ آں حضرتؐ نے فرمایا نہیں میں ناراض نہیں ہوا تھا۔ بلکہ اس بارے میں خدا کے حکم کا منتظر تھا۔ اب جبرئیلؑ نے مجھے بتایا ہے کہ اے محمدؐ تمہارے پروردگار کا حکم ہے کہ علی ابن ابی طالبؑ تمہاری امت اور خاندان میں تمہارے جانشین اور وصی ہوں گے۔ روز محشر وہ تمہارے پرچمدار ہوں گے۔[2]

اولی الامر کون ہیں:

اہل سنت کے بہت سے علماء نے اولوالامر کے معنی میں غلطی کی ہے۔ ہر صاحب اقتدار کو چاہے وہ ظلم و ستم کے ذریعہ ہی برسر اقتدار کیوں نہ آیا ہو اولی الامر سمجھ لیا ہے۔ اور اسے واجب الاطاعۃ جانا ہے۔ یہ امر ظالم و ستمگر حکمرانوں کی تقویت کا اور مسلمانوں کے لیے ہزاروں مشکلوں کا سبب بنا ہے۔ لیکن شیعہ ہر حاکم کو اولوالامر نہیں مانتے بلکہ یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ اولوالامر وہ بارہ ہستیاں ہیں جو پیغمبرؐ کی جانشین ہیں جن کی اطاعت خدا اور پیغمبرؐ کی اطاعت ہے۔

اس سلسلہ میں جابر پیغمبر اکرمؐ سے ایک حدیث نقل کرتے ہیں جو اس مطلب کو بخوبی ثابت کرتی ہے۔

جابر کہتے ہیں جب یہ آیۃ یاایھاالذین امنوا اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم (ایمان والو اللہ کی اطاعت کرو رسول اور صاحبان امر کی اطاعت کرو جو تمہیں میں سے ہیں) نازل ہوئی تو میں نے رسول اللہؐ سے کہا ہم خدا اور اس کے رسولؐ کو پہچانتے ہیں اور ان کی اطاعت بھی کرتے ہیں لیکن یہ اولوالامر کون ہیں جن کی اطاعت کو خدا نے اپنی اور آپ کی اطاعت کے برابر بتایا ہے؟

---

[1] رجال کشی / ۱۲۳ [2] امالی شیخ مفیدؒ / ۱۰۰

آں حضرتؐ نے فرمایا۔ اولوالامر میرے جانشین اور میرے بعد امت کے پیشوا اور رہبر ہیں ان میں سب سے پہلی فرد علی بن ابی طالبؑ ہیں اس کے بعد حسنؑ ہیں پھر حسینؑ ان کے بعد علی ابن الحسینؑ۔ ان کے بعد محمد بن علیؑ ہیں جن کا نام توریت میں باقر مشہور ہے اور تم انھیں درک کرو گے (ان کے زمانے تک زندہ رہو گے) جب ان کی زیارت کرنا میرا سلام ان تک پہنچا دینا۔ ان کے بعد صادق جعفر بن محمدؑ۔ ان کے بعد موسیٰ بن جعفرؑ۔ ان کے بعد علی بن موسیٰؑ۔ ان کے بعد محمد بن علیؑ ان کے بعد علی بن محمدؑ۔ ان کے بعد حسن بن علیؑ اور ان کے بعد ان کے فرزند جن کا نام میرا نام اور جن کی کنیت میری کنیت ہوگی، یہی ہوں گے جو مشرق و مغرب کو فتح کریں گے، لوگوں کی نظروں سے غائب رہیں گے۔ ان کی غیبت بہت طولانی ہوگی جس کے سبب کچھ لوگ ان کی امامت میں شک کرنے لگیں گے، بجز ان لوگوں کے جن کے دلوں کو اللہ نے ایمان کی دولت سے مالا مال کر رکھا ہے۔[۱]

روایات لوح پر ایک نظر:

جابر سے بہت سی روایات نقل ہوئی ہیں جن کا مضمون یہ ہے کہ پیغمبرؐ کی دختر گرامی جناب فاطمہ زہرا علیہا السلام نے جابر کو ایک لوح (تختی) دکھائی جس میں ائمہ اثنا عشر یعنی حضرت علیؑ سے حضرت امام مہدیؑ تک تمام بارہ اماموں کے نام موجود تھے۔ ان روایات میں بعض، تاریخی نقطۂ نظر سے صحیح نہیں معلوم ہوتیں کیوں کہ ان روایات میں جابر کو امام صادق علیہ السلام سے ملاقات کرتے ہوئے بتایا ہے۔ جب کہ علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ جابر امام باقر علیہ السلام کی حیات میں ہی وفات پا چکے تھے اور انھوں نے امام صادق علیہ السلام کو نہیں دیکھا ہے۔ ایک روایت بطور نمونہ ذیل میں درج ہے۔

امام باقر علیہ السلام نے اپنے آخری لمحات میں اپنے فرزند امام صادق علیہ السلام کو بلایا اور امامت کی ذمہ داری ان کے سپرد کی۔

امام محمد باقرؑ کے بھائی، زید بن علی بھی وہاں موجود تھے جو امامت کے عہدہ پر فائز ہونے کے خواہشمند تھے۔ زید نے امام باقرؑ سے کہا کیا اچھا ہوتا اگر آپ بھی وہی کام کرتے جو امام حسنؑ نے کیا تھا (یعنی اپنے بعد اپنے بھائی کو امامت سونپی تھی)۔ امام باقر علیہ السلام نے اس بات کی وضاحت کی کہ اپنے بعد کسی کو امام بنانا میری

۱۔ تفسیر صافی۔ ج۱/۳۶۶ کمال الدین و تمام النعمۃ ج۱/۳۶۵

اپنی پسند و ناپسند پر منحصر نہیں ہے اور نہ ہی اس پر میرا کوئی اختیار ہے۔ امامت ایک الہٰی امانت ہے جو گزشتہ اماموں نے ان تک پہنچائی ہے اور ان پر (امام باقرؑ پر) واجب ہے کہ وہ حکم خدا اور ان کی وصیتوں کے مطابق عمل کریں۔ اس وقت آپ نے اپنی بات کی تائید کے لیے جابر بن عبداللہ کو بلوایا اور ان سے سارے مجمع میں لوح کے بارے میں پوچھا۔ جابر نے لوح کی روایت تفصیل سے نقل کی۔[1]

اس روایت سے پتہ چلتا ہے کہ امام باقرؑ کی وفات کے وقت جابر اور امام صادق علیہ السلام دونوں موجود تھے۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ امام باقر علیہ السلام کی وفات سے پہلے جابر اس دنیا سے سدھار چکے تھے۔ انھوں نے امام صادق علیہ السلام کا زمانہ نہیں دیکھا۔

معاویہ کی عطا کو ٹھکرادیا:

جیسا کہ بیان ہو چکا ہے جابر خاندان رسالت سے بڑی گہری محبت رکھتے تھے اور ان کے دشمنوں سے دشمنی رکھتے تھے۔

جابر کا ایک مرتبہ کسی کام سے شام جانا ہوا وہاں وہ معاویہ سے ملاقات بھی کر لینا چاہتے تھے۔ معاویہ جابر کو محب اہل بیتؑ ہونے کی بنا پر چند دنوں تک ٹالتا رہا۔ کچھ دنوں بعد انھیں ملاقات کی اجازت دی۔ آپ نے معاویہ کے محل میں داخل ہوتے ہی اس سے کہا کیا تم نے پیغمبر اسلام سے یہ بات نہیں سنی ہے کہ: "جو شخص محتاجوں اور مصیبتوں میں مبتلا افراد کی مدد کرنے سے گریز کرے گا۔ خدا اس کو مصیبت اور پریشانی کے زمانہ میں اپنی رحمت سے دور کر دے گا۔"[2]

جابر کی یہ حدیث سنکر معاویہ آگ بگولہ ہو گیا اور کہا میں نے پیغمبر سے سنا ہے کہ آپ نے فرمایا۔ میرے بعد تم لوگوں کا ایک ایسی حکومت سے واسطہ پڑے گا جس کے ظلم اور ستم پر تمہیں صبر اور شکیبائی سے کام لینا ہوگا۔ جابر نے کہا معاویہ تو سچ کہتا ہے میں جو بھول چکا تھا تو نے مجھے یاد دلا دیا۔ اتنا کہہ کر آپ معاویہ کے محل سے باہر نکل آئے اور شام سے روانہ ہو گئے۔

معاویہ نے اس امر کی تلافی کے لیے جابر کی خدمت میں چھ سو دینار بھیجے۔ جابر نے یہ پیسہ واپس کر دادیا اور

---

[1] کمال الدین و تمام النعمۃ ج۱ / ۳۲۳ چاپ تہران۔ عیون اخبار الرضاؑ ۱ / ۴۰۔ بحار الانوار ج ۳۶ / ۱۹۲

[2] من حجب ذا الفاقة وحاجة حجبه الله يوم فاقته وحاجته۔

لانے والے سے کہا کہ جاؤ معاویہ سے کہہ دو، اے جگر خوار عورت کی اولاد میں ہرگز تیرے نامۂ اعمال میں نیکی لکھے جانے کا وسیلہ نہیں بن سکتا۔[1]

پیغمبرؐ کے پیغامبر!

جابر کے افتخارات میں سے ایک بات یہ بھی ہے کہ آپ امام باقرؑ کے لیے رسول اللہؐ کے سلام کے حامل تھے۔ جابر نے پیغمبر اسلامؐ کی رحلت کے مدتوں بعد شیعوں کے پانچویں پیشوا کی خدمت میں آں حضرتؐ کا سلام پہنچایا۔

امام باقر علیہ السلام فرماتے ہیں:

ایک دن میں جابر ــــ جو کہ نابینا ہو چکے تھے ــــ کے پاس گیا۔ اور انھیں سلام کیا، میرے سلام کا جواب دے کر انھوں نے پوچھا تم کون ہو؟ میں نے کہا:

میں محمد بن علی بن الحسینؑ ہوں۔

جابر نے کہا بیٹا میرے نزدیک آنا! میں نزدیک گیا جابر نے میرے ہاتھوں کو بوسہ دیا اور میرے پاؤں چومنے کے لیے جھکے ہی تھے کہ میں وہاں سے ہٹ گیا۔ اس وقت جابر نے کہا: پیغمبر اسلامؐ نے آپ کو سلام کہا ہے میں نے کہا خدا کا سلام، رحمتیں اور برکتیں ہوں پیغمبر خداؐ پر، پیغمبر اسلامؐ نے کس طرح سلام کہلوایا ہے؟

جابر نے کہا میں ایک دن پیغمبرؐ کی خدمت میں موجود تھا آپ نے فرمایا: جابر تمہاری عمر اتنی لمبی ہوگی کہ میرے ایک فرزند جس کا نام محمد بن علی بن الحسین ہوگا کو درک کروگے خدا میرے اس فرزند کو نور و حکمت عطا کرے گا۔ جب بھی تم اس سے ملاقات کرنا اس کو میرا سلام پہنچا دینا۔[2]

مرحوم صدوق اس واقعہ کو ایک روایت میں الگ طریقہ سے بیان کرتے ہیں، لکھتے ہیں:

جابر بن عبداللہ انصاری کہتے ہیں پیغمبر خداؐ نے مجھ سے فرمایا جابر تمہاری عمر اتنی لمبی ہوگی کہ میرے فرزند محمد بن علی بن الحسین کو ــــ جس کا نام توریت میں "باقر"[3] ہے ــــ دیکھو گے۔ جب بھی تم ان سے ملاقات کرنا

---

[1] قاموس الرجال ج ۲ ص ۳۱۷ بنقل از مروج الذہب۔ [2] ارشاد مفید / ۲۴۵ [3] باقر مادۂ بقرہ سے شگافتہ کرنے کے معنی میں آتا ہے، پانچویں امام کا لقب باقر تھا یعنی علوم کی مشکل گتھیوں کو سلجھانے اور حل کرنے والا۔

میرا سلام ان تک پہنچا دینا۔

جابر نے ایک دن مدینہ کی ایک گلی میں حضرت امام باقرؑ کو دیکھا تو پوچھا: اے جوان تم کون ہو؟ امامؑ نے جواب دیا: میں محمد بن علی بن الحسینؑ ہوں۔

جابر نے کہا: بیٹا آگے آؤ۔ امامؑ آگے بڑھے۔

جابر نے پھر کہا: بیٹا لوٹ جاؤ! امامؑ لوٹ گئے۔ جب جابر نے امامؑ کی شکل و شمائل اچھی طرح سے دیکھ لی تو کہا: خدائے کعبہ کی قسم یہ سراپا عیناً پیغمبرؐ کا سراپا ہے۔ پھر جابر نے کہا بیٹا پیغمبرؐ نے تمہیں سلام کہا ہے۔ امام باقرؑ نے فرمایا: میرا ادائی سلام ہو پیغمبر اسلام پر۔ تم پر خدا کی رحمتیں ہوں کہ تم نے مجھ تک پیغمبرؐ کا سلام پہنچایا۔ اسی وقت جابر نے تین مرتبہ کہا: یا باقر! تم درحقیقت علمی گتھیاں کھولنے والے ہو۔ اس دن کے بعد سے جابر ہمیشہ امام باقر علیہ السلام کی خدمت میں شرفیاب ہوتے رہے اور آپ کے گنجینۂ علوم سے خوب استفادہ کیا۔ کبھی کبھی جابر سے پیغمبر اسلامؐ کی حدیثیں نقل کرنے میں غلطی ہو جاتی تھی تو امام باقر علیہ السلام ان غلطیوں کی اصلاح فرماتے تھے اور صحیح صورت میں حدیث بیان فرماتے تھے۔ جابر بھی امام علیہ السلام کے آگے سر تسلیم خم کر دیتے تھے اور کہتے تھے اے باقر۔ اللہ کو شاہد بنا کر کہتا ہوں کہ تم ایام طفلی ہی میں منصب امامت پر فائز ہوئے ہو۔[۱]

ایک سوال:

یہاں پر اس نکتہ کو بیان کرنا ضروری ہے کہ جابر کی امام باقر علیہ السلام سے ملاقات اور پیغمبر اسلامؐ کا سلام پہنچانے کا واقعہ، مختلف روایات میں الگ الگ اور ملتے جلتے مضمون کے ساتھ، رجال کشی، کشف الغمہ، امالی صدوق، امالی شیخ طوسی، اختصاص مفید، وغیرہ جیسی کتابوں میں نقل ہوا ہے۔ ان میں سے دو نمونے ہم پیش کر چکے ہیں یہ روایات دو طرح سے متناقض دکھائی دیتی ہیں۔ اولاً: بعض روایات کے مطابق جابر امام باقر علیہ السلام سے مدینہ کی گلیوں میں ملاقات کرتے ہیں، بعض روایات کے مطابق امام زین العابدینؑ کے گھر میں اور کچھ روایات کے مطابق خود امام باقر علیہ السلام جابر کے پاس تشریف لے جاتے ہیں اور جابر وہاں امام باقر علیہ السلام کو پہچانتے ہیں۔

۱۔ علل الشرائع ج ۱/ ۲۳۳ - بحار الانوار ج ۴۶/ ۲۲۵

ثانیاً: ان روایات میں سے بعض میں یہ بتایا گیا ہے کہ جابر ملاقات کے وقت نابینا تھے (جیسے پہلی حدیث میں) دیگر روایات میں ہے جابر نے غور سے امام کے سراپا کا جائزہ لیا (جیسے حدیث دوم) ظاہر سی بات ہے یہ موضوع جابر کی نابینائی سے مطابقت نہیں رکھتا۔ اب یہ سوال پیش آتا ہے کہ ان روایتوں کا تناقض کیسے برطرف ہو سکتا ہے؟

جواب:

پہلے تناقض کا یہ جواب ہو سکتا ہے کہ مختلف جگہ پر اس واقعہ کا ہونا حدیثوں کا ایک دوسرے کے منافی ہونے کا سبب نہیں بن سکتا کیوں کہ اس بات پر قرائن موجود ہیں کہ جابر نے اہل بیتؑ کے تئیں اپنے خاص اخلاص و محبت کے زیر اثر یہ چاہا ہو کہ پیغمبرؐ کی پیشگوئی اور ان کا سلام پہنچانے کا بار بار اور مختلف جگہوں پر تذکرہ کیا جائے تاکہ اس طرح سے امام باقر علیہ السلام کی عظمت مزید اجاگر ہو جائے لہٰذا اگر یہ واقعہ مختلف جگہوں پر پیش آیا ہو تو اس میں کیا قباحت ہے۔

دوسرے تناقض کا یہ جواب ہے کہ وہ روایات جو بتاتی ہیں کہ جابر نے امام باقر علیہ السلام کے سراپا کا بغور جائزہ لیا۔ یہ روایات جابر کی نابینائی سے پہلے کی ہوں گی۔

خدا کی مرضی کے سامنے تسلیم و رضا:

جابر بن عبداللہؓ عمر کے آخری دنوں میں ضعف و پیری میں مبتلا ہو گئے۔ جب امام باقر علیہ السلام ان کو دیکھنے کے لیے تشریف لے گئے اور آپ نے ان سے خیریت دریافت کی تو جابر نے کہا: میری یہ حالت ہے کہ میں اس وقت بڑھاپے کو جوانی پر، بیماری کو تندرستی پر، مرنے کو جینے پر ترجیح دیتا ہوں۔

امام باقرؑ نے ان کی ہدایت و رہنمائی کرتے ہوئے فرمایا۔

لیکن میں، اگر خدا مجھے بوڑھا کر دے، تو میں بڑھاپے کو دوست رکھوں گا۔ اگر جوان کر دے تو جوانی کو پسند کروں گا۔ اگر بیمار کر دے تو بیماری کو پسند کروں گا اور اگر شفا عطا کر دے تو شفا و صحت مندی کو دوست رکھتا ہوں۔ اگر موت دیدے تو موت کو پسند کرتا ہوں اور اگر زندہ رکھے تو زندگی کو۔ جابر نے جب آپ کی یہ باتیں سنیں تو آپ کے ہاتھ پر بوسہ دیا اور کہا۔ رسول خداؐ نے سچ فرمایا تھا انھوں نے مجھ سے فرمایا ہے کہ تم

میرے فرزندوں میں سے ایک فرزند سے ملاقات کروگے جس کا نام میرے نام پر ہوگا ۔ وہ علمی مشکلات کو حل کرنے والا ہوگا، اسی بنا پر اس کو باقر علوم اولین و آخرین کا لقب دیا جائے گا۔

امام علیہ السلام کی اس بات سے پتہ چلتا ہے کہ جابر مقام صبر کے حامل تھے اور امام باقر علیہ السلام مقام رضا پر فائز تھے [1]

یہ حدیث ہمیں اسلام کے ایک اعلیٰ اصول کی طرف متوجہ کرتی ہے جس کو قرآن اور حدیث میں مقام تسلیم سے تعبیر کیا گیا ہے اور علماء و حکماء کی زبان میں رضا کہا جاتا ہے۔

اصولاً حقیقی اسلام اور اعلیٰ درجہ کا ایمان اسی صورت میں متحقق ہوتا ہے جب مومن میں یہ معنوی حالت پیدا ہو جائے کہ وہ سارے امور خدا کے سپرد کر دے اور اختیار و قدرت سے خارج حادثات پر تقدیر خدا پر بغیر چوں و چرا کے راضی ہو جائے اور ماتھے پر شکن بھی نہ آئے۔

انسان جن حادثات میں گرفتار ہوتا ہے وہ دو طرح کے ہیں۔

۱۔ ایسے حادثات جو انسان کے اختیار و قدرت میں ہیں۔

۲۔ ایسے حادثات جو انسان کے اختیار اور قدرت سے خارج ہیں۔

پہلی قسم میں اپنی زندگی کے لیے لائحہ عمل بنانے والا اور اپنی قسمت بنانے والا خود انسان ہے اور ہر طرح کی سعادت و خوشبختی، یا شقاوت اور بدبختی جو اس کے دامن گیر ہوگی اس کا ذمہ دار وہ خود ہی ہے ایسے ماحول میں انسان کی آزادی اور اختیار کے علاوہ قضا و قدر نام کی کوئی چیز نہیں ہے اور دیگر عوامل خود انسان کے ارادہ اور مشیت سے وجود میں آتے ہیں اسی سلسلے میں قرآن میں ارشاد ہے۔

لیس للانسان الا ما سعیٰ (نجم/۳۹)

اور انسان کے لیے صرف اتنا ہی ہے جتنی اس نے کوشش کی ہے

نیز ارشاد ہوتا ہے:

لھا ما کسبت و علیھا ما اکتسبت (بقرہ/۲۸۶)

ہر نفس کے لیے اس کی حاصل کی ہوئی نیکیوں کا فائدہ بھی ہے اور اس کی کمائی ہوئی برائیوں کا نقصان بھی۔

---

[1] مجالس المومنین۔ چاپ قدیم ص ۱۱۰ نقل از کتاب اوصاف الاشراف تالیف مرحوم خواجہ نصیر الدین طوسی۔

بطور کلی سارے آسمانی احکام وقوانین خواہ واجب ہوں یا حرام یا جزائی و سزائی قوانین ان سب کی بنیاد اس امر پر استوار ہے کہ بشر خود مختار و آزاد ہے اور اپنے کاموں کا خود ذمہ دار ہے۔

دوسری قسم میں کچھ عامل جو انسان کی قدرت و ارادہ سے خارج ہوتے ہیں اس کو ایسے حوادث سے دوچار کر دیتے ہیں کہ وہ ان سے مقابلہ کی توانائی نہیں رکھتا اور چوں کہ ان حوادث کا سرچشمہ خدا کا حکیمانہ ارادہ ہوتا ہے لہٰذا عارف انسان کے لیے مقام ربوبی کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں رہتا اور جو خدا کو پسند ہے وہ خود بھی پسند کرے اور اسی پر راضی رہے۔ یہ رضا و تسلیم ایمان کامل اور سچے خلوص کی نشانیاں ہیں۔ ہم یہاں پر تسلیم و رضا کی حقیقت کو واضح کرنے کے لیے امیرالمومنین علیہ السلام کے قول کا سہارا لیتے ہیں۔

امیرالمومنین علیہ السلام اپنے ایک خطبہ میں فرماتے ہیں کہ اسلام درحقیقت مسلمان کا تشریع اور تقدیر الٰہی کے سامنے سر تسلیم خم کرنا ہے۔ آپ فرماتے ہیں —— الاسلام ھو التسلیم[1] اسلام تقدیر الٰہی کے سامنے تسلیم ہونے کا نام ہے۔

اس بات میں شک نہیں کہ مقام رضا، مقام صبر سے بہت بلند ہے کیوں کہ صابر خدا کے ارادہ کے مقابلہ میں خود کو بھی صاحب اختیار و ارادہ سمجھتا ہے اور دو چیزوں میں سے ایک کو ترجیح دیتا ہے لیکن مقام رضا پر فائز فرد خود سے بیگانہ ہے یعنی عالم بے خودی میں غرق ہے۔ اور خدا کے ارادہ کے مقابلہ میں اپنے لیے کسی اختیار و ارادہ کا قائل ہی نہیں ہے جابر کے ساتھ امام باقرؑ کی گفتگو اس عرفانی نکتہ کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

امام حسین علیہ السلام کا پہلا زائر:

بہت سی عظیم دینی علمی اور سماجی شخصیتیں ایسی ہیں جو اپنے زمانے میں پہچانی نہیں جاتیں اور گمنام رہتی ہیں۔ حکومتوں کے مفادات و مصالح اور ذاتی دشمنیاں اس کی اجازت نہیں دیتیں کہ لوگ انھیں اس طرح سے پہچانیں جیسا کہ ان کا حق ہے۔ ان کی عظمت پر معاصرت (ہم عصر ہونے) کا پردہ بھی پڑ جاتا ہے۔ لیکن چوں کہ حقیقت ہمیشہ چھپائی نہیں جا سکتی زمانے کے گزرنے اور ذاتی عداوتوں کے ختم ہو جانے سے ان چیزوں سے ابہام اور گمنامی کا غبار دھیرے دھیرے ہٹتا جاتا ہے اور ان کی عظیم شخصیت ابھر کر سامنے آجاتی ہے۔

---

[1] نہج البلاغہ۔ کلمات قصار شمارہ ۱۲۵

اپنے وہم و گمان میں لا سکتی ہے، وہ اس آیۂ کریمہ میں بیان ہوئی ہے۔

نعمتوں کی قسمیں:

اگر ہم تمام الٰہی نعمتوں کو چند کلی عنوانات کے تحت بیان کرنا چاہیں تو انھیں پانچ عام عنوانات کے تحت خلاصہ کریں گے:

۱۔ نعمتِ وجود۔ جس سے خدا نے ہمیں نوازا ہے، سب سے اہم نعمت ہے اور تمام نعمتیں اس کے بعد کی چیزیں ہیں۔ کیونکہ جب تک انسان وجود نہیں پائے گا، دوسری نعمتوں سے اس کے لیے استفادہ بے معنی رہے گا۔ اس بنا پر سب سے پہلی نعمت جس کی برکت سے بقیہ نعمتوں سے سرفراز ہوا جا سکتا ہے، یہ ہے کہ خدا نے انسان کو وجود بخشا ہے اور اسے جامۂ ہستی سے آراستہ کیا ہے۔

۲۔ نعمتِ عقل: عقل و خرد کی نعمت کے ذریعہ انسان دوسرے زندہ موجودات سے ممتاز قرار پایا ہے۔ کیونکہ حیوانات اس نعمت سے بے بہرہ ہیں، اسی لیے وہ بعض الٰہی نعمتوں سے محروم ہیں۔ عقل وہ نعمت ہے جس کے ذریعہ کلی مطالب کو درک کیا جا سکتا ہے۔ الٰہی لا متناہی علوم کو حاصل کیا جاتا ہے۔ اور اسی کے ذریعہ بشری تمدن و ثقافت کی ایجاد ممکن ہے اور انسان اسی کے وسیلے ارتقا حاصل کر کے پروردگارِ عالم سے قریب ہو سکتا ہے۔ لہٰذا نعمتِ وجود کے بعد یہ سب سے بڑی نعمت شمار ہوتی ہے۔ اسی لیے قرآن کریم اور احادیث معصومینؑ میں اس پر زیادہ تکیہ کیا گیا۔

۳۔ وہ نعمتیں جن کے ذریعہ سے انسانی جسم کو رشد و کمال حاصل ہوتا ہے۔ اس لیے کہ انسان جسم و روح سے مرکب ہے اور دونوں اعتبار سے انسان رشد و کمال کا محتاج ہے۔ مثلاً کھانے پینے، سونگھنے کی چیزوں نیز نور، ہوا، دریا، صحرا، سورج، چاند اور اس دنیا کی بہت سی چیزیں ہیں جو جسم انسانی کی بقا کے لیے پیدا ہوئی ہیں۔

۴۔ وہ نعمتیں جو روح کے رشد و کمال کا ذریعہ ہیں۔ انسانی روح میں جسم کی بہ نسبت کمال پانے کی استعداد و صلاحیت کہیں زیادہ پائی جاتی ہے، بلکہ دونوں کو ایک دوسرے سے قیاس نہیں کر سکتے۔ اور روح جب ارتقا پاتی ہے تو جبرئیل جیسا فرشتہ اس کے سامنے زانوئے ادب تہ کر کے استفادہ کرتا ہے۔ البتہ جسم کے اعتبار سے انسانی کمال بہر صورت محدود ہے۔ انسان روح کی تربیت کے سہارے

یہ باتیں امام حسین علیہ السلام کی ذات کے بارے میں کم و بیش صادق آتی ہیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ اس زمانے کے بہت سے لوگ امام حسین علیہ السلام کو اچھی طرح سے نہیں پہچانتے تھے اور آپ کی عظمت سے ناآشنا تھے۔ کچھ ہی لوگ تھے جو آپ کے بلند مقام سے آگاہ تھے۔ ان لوگوں کو بھی آپ کی شہادت کے بعد آپ کی عظمت و شہادت کے بارے میں اظہار نظر کی جرأت نہ تھی کیوں کہ اموی حکومت سے مرعوب ہو چکے تھے۔

بہت کم ایسے افراد تھے جو جرأت کے ساتھ خود کو ہر طرح کے خطرات میں ڈال کر امام کا ذکر خیر کیا کرتے تھے۔ اور ان کے دشمنوں اور قاتلوں پر لعنت بھیجا کرتے تھے۔ اس گروہ میں سب سے پیش پیش اور نمایاں شخصیت جابر بن عبداللہ انصاری کی تھی۔ آپ نے خاندان رسالتؐ سے محبت کے اظہار میں اپنی طرف سے ایک زرّیں سند چھوڑی ہے۔ ابھی امام حسینؑ کی شہادت کو چالیس دن بھی نہ گزرے تھے کہ آپ ان کی پاک و پاکیزہ قبر کی زیارت کے لیے نکل پڑے۔

حادثۂ کربلا کے بعد اسلامی معاشرہ یزید کی ظاہری ہیبت اور طاقت سے مرعوب ہو گیا تھا اور امام حسینؑ کی شہادت سے عوام الناس کو شدید جھٹکا لگا تھا۔ جابر ان انگشت شمار افراد میں سے تھے جو پلید اموی حکومت کی طاقت سے مرعوب نہیں ہوئے تھے۔ جابر نے امام حسینؑ کی شخصیت کو پہچنوانے کے لیے بڑا عظیم قدم اٹھایا۔ مدینہ سے کربلا کی طرف روانہ ہوئے تاکہ امام حسینؑ شہید راہ حق کی قبر مطہر کی زیارت کریں اس طرح سے جابر نے امامؑ کے دشمن اور مخالفوں کے خلاف نفرت اور غصے سے لبریز آواز بلند کی۔

جابر کے اقدام کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ اس وقت تک یزید کی حکومت اور اقتدار کی وحشت دلوں پر چھائی ہوئی تھی اور کسی میں جرأت نہیں تھی کہ وہ کھلے بندوں امام حسینؑ کی زیارت کے لیے جائے۔

دوسری بات یہ کہ جابر کوئی عام آدمی نہیں تھے بلکہ رسول اللہؐ کے جلیل القدر صحابیوں میں سے تھے اور عام سلمانوں میں آپ کی مقبولیت تھی۔ آپ ممتاز شخصیت کے مالک تھے چنانچہ امام باقر علیہ السلام بہت سے موارد میں رسول اللہ کی حدیثیں جابر سے نقل کیا کرتے تھے تاکہ مخالفین کے لیے کوئی بہانہ یا حجت باقی نہ رہے۔ ــــ جیسا کہ پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے ــــ لہٰذا اگر جابر ان خصوصیات کے ساتھ امام حسینؑ کی زیارت کے لیے روانہ ہوتے ہیں تو یہ یزیدی حکومت پر ایک کاری ضرب ہے اور جابر کی زندگی میں ایک زرّیں باب اور افتخار کا اضافہ ہے۔

جابر عطیہ کوفی[1] کے ہمراہ کربلا کی طرف روانہ ہوتے ہیں اور صفر کی بیسویں تاریخ ۶۱ھ امام حسینؑ کے چہلم کے دن آپ کی قبر مطہر کی زیارت سے شرفیاب ہوتے ہیں۔ ان ہی دنوں امام حسینؑ کے اہل حرم بھی شام سے کربلا میں وارد ہوتے ہیں۔ جابر کربلا کے اطراف کے لوگوں کے ساتھ سید الشہداء علیہ السلام کے نوحہ و ماتم میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ جابر کی زیارت کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ انھوں نے اپنے اس عمل سے ولایت سے وابستگی اور خاندان رسالت سے محبت کے سلسلے میں آئندہ نسلوں کو عظیم درس دیا ہے۔

بہتر ہے اس زیارت کی تفصیل خود عطیہ کی زبانی سنی جائے۔ عطیہ کہتے ہیں۔ جابر بن عبداللہ انصاری میرے

---

[1] عطیہ بن سعد بن جنادہ عوفی کوفی، جدلی، ان کی کنیت ابو الحسن ہے۔ آپ تابعین اور امامیہ کے بزرگ راویوں اور محدثوں میں سے ہیں اس کے علاوہ جیسا کہ آپ کی زندگی کے حالات سے ظاہر ہے یہ ایک مرد مجاہد تھے جنھوں نے بنی امیہ کی حکومت کی مخالفت کی اور اس راہ میں بڑے صدمات جھیلے۔ یہ اہل کوفہ میں سے ہیں اور امیر المومنینؑ کی ظاہری خلافت کے دوران پیدا ہوئے۔ آپ کی والدہ ایک رومی کنیز تھیں۔

خود عطیہ نقل کرتے ہیں جب ان کی پیدائش ہوئی تو ان کے والد انھیں امیر المومنین علیہ السلام کی خدمت میں لے کر آئے اور ان کے لیے نام تجویز فرمانے کی خواہش کی۔ امیر المومنین علیہ السلام نے فرمایا۔ ھذا عطیۃ اللہ۔ یہ الٰہی عطیہ ہے۔ اس دن سے ان کا نام عطیہ پڑ گیا۔ امیر المومنینؑ نے سو درہم بیت المال سے ان کا وظیفہ مقرر فرمایا جو ان کے والد سعد کو پیش کیا گیا۔ عطیہ نے ابن اشعث کے ہمراہ حجاج بن یوسف ثقفی، بنی امیہ کے دور کے خونخوار اور ستمگر فرد کے خلاف قیام کیا۔ ابن اشعث کو شکست کے بعد عطیہ نے بلاد فارس میں پناہ لی۔

حجاج نے محمد بن قاسم ثقفی کو، فارس لکھ بھیجا کہ عطیہ کو بلا کر یہ حکم دو کہ وہ علی بن ابی طالب پر لعنت بھیجیں اگر وہ اس سے انکار کریں تو انھیں چار سو تازیانے مارنا اور ان کے سر کے بال اور داڑھی تراش دینا۔

محمد بن قاسم نے انھیں بلا کر حجاج کا خط دکھایا عطیہ نے امیر المومنینؑ کی شان میں گستاخی کرنے سے انکار کر دیا۔ محمد بن قاسم نے انھیں چار سو تازیانے لگائے اور ان کے سر و صورت کے بالوں کو ترشوا دیا۔

جب قتیبہ خراسان کا حاکم بنا عطیہ اس کے پاس چلے گئے اور عمر بن ہبیرہ کے حاکم عراق بننے تک خراسان میں مقیم رہے۔ اس وقت عمر بن ہبیرہ کو خط لکھا اور عراق لوٹنے کی اجازت طلب کی۔ اس کی موافقت کے بعد وہ اپنے اصل وطن کوفہ لوٹ آئے اور وہیں مقیم رہے یہاں تک کہ ۱۱۱ھ میں دار فانی سے کوچ کر گئے (طبقات ابن سعد ج ۶/ ۳۰۴)

ہمراہ امام حسین علیہ السلام کی قبر کی زیارت کے لیے روانہ ہوئے۔ کربلا کے نزدیک پہنچ کر جابر نے نہر فرات میں غسل کیا۔ لباس پہنا اور خوشبو لگائی اور قبر مطہر کی طرف بڑھنے لگے ہر قدم پر آپ کی زبان پر ذکر خدا جاری تھا۔ جابر جب قبر مطہر کے پاس پہنچ گئے تو مجھ سے کہا میرا ہاتھ قبر تک لے جاؤ۔ میں نے ان کا ہاتھ قبر مطہر پر رکھا۔ جابر فرط غم واندوہ سے بیہوش ہو گئے اور قبر مطہر پر گر گئے۔ میں نے جابر کے سر و صورت پر پانی چھڑکا۔ ہوش آتے ہی جابر نے تین مرتبہ کہا یا حسینؑ پھر کہا: یہ کیسا دوست ہے جو دوست کا جواب نہیں دیتا۔ پھر خود ہی اپنا جواب دیتے ہوئے کہتے ہیں آپ کس طرح جواب دے سکتے ہیں جب کہ آپ کی گردن کی رگیں کاٹ دی گئی ہیں آپ کا خون بہا دیا گیا ہے اور آپ کا سر تن سے جدا کیا جا چکا ہے۔

میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ خیر الانبیاء کے فرزند ہیں۔ مومنوں کے سردار کے فرزند ہیں۔ نسل ہدایت سے ہیں اور ہمزاد تقویٰ ہیں۔ اصحاب کساء کی پانچویں فرد ہیں اللہ کے برگزیدہ بندے کے فرزند ہیں اور فاطمہ سیدہ نساء العالمین کے فرزند ہیں ایسا کیوں نہ ہو کہ آپ کو پیغمبروں کے سردار نے خود اپنے ہاتھوں سے غذا دی ہے متقیوں کی آغوش میں پرورش پائی ہے اور ایمان کی چھاتی سے دودھ پیا ہے۔

آپ زندگی میں بھی اور موت کے بعد بھی پاک و پاکیزہ ہیں آپ کے فراق میں مومنین کے دل غمناک ہیں لیکن آپ کے زندہ ہونے میں انہیں شک نہیں ہے۔

خدا کا درود و سلام ہو آپ پر میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ نے اپنے بھائی یحییٰ بن زکریا کی راہ میں قدم اٹھایا اور ان ہی کی طرح شہید ہوئے۔ پھر جابر نے امامؑ کی قبر کے اطراف پر نظر ڈالتے ہوئے کہا:

اے پاک و پاکیزہ روحو جو حسینؑ کی بارگاہ اور ان کے آستان میں سوئی ہو تم سب پر سلام و درود ہو!

میں گواہی دیتا ہوں کہ تم نے نماز برپا کی اور زکوٰۃ ادا کی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کیا۔ لادینوں سے جہاد کیا اور خدا کی پرستش کرتے رہے یہاں تک کہ موت نے تمہیں اپنی آغوش میں سمیٹ لیا۔ قسم اس خدا کی جس نے محمدؐ کو پیغمبر بنا کر بھیجا ہم بھی تمہارے ساتھ اجر میں شریک ہیں۔

عطیہ کہتے ہیں میں نے پوچھا:

ہم ان شہیدوں کے اجر میں کس طرح شریک ہیں جب کہ راہ شہادت میں ہم نے کوئی قدم نہیں اٹھایا ہے اور نہ تلوار چلائی ہے جب کہ راہ خدا میں ان لوگوں کے سر تن سے جدا ہو گئے ہیں۔ ان کے بچے یتیم اور بیویاں بیوہ ہو گئی ہیں!

جابر نے جواب دیا: اے عطیہ میں نے پیغمبرؐ سے سنا ہے کہ جو شخص جس گروہ کو دوست رکھے گا قیامت کے دن اس کی صف میں جگہ پائے گا اور اس کے ساتھ ایک جگہ محشور ہوگا۔ اور جو شخص جس گروہ کے عمل کو دوست رکھے گا اس گروہ کے عمل کی جزا و سزا میں شریک قرار پائے گا۔ قسم ہے اس پروردگار کی جس نے محمدؐ کو پیغمبر بنا کر بھیجا، میرا اور میرے دوستوں کا اعتقاد اور نیت وہی ہے جو امام حسینؑ اور ان کے ساتھیوں کی تھی۔

عطیہ کہتے ہیں اس وقت شام کی طرف سے کوئی کاروان آتا دکھائی دیا میں نے جابر سے کہا: لگتا ہے شام کی طرف سے کوئی کاروان آرہا ہے۔ جابر نے کہا جاؤ اس کاروان کے بارے میں معلوم کر کے آؤ اگر عمر بن سعد کے افراد ہوں تو فوراً آکر خبر کرو۔ عطیہ گئے اور بہت جلدی واپس آگئے اور جابر سے کہا: جابر اٹھو اور حرم رسول خداؐ کا استقبال کرو۔ یہ زین العابدینؑ ہیں جو اپنی بہنوں اور پھوپھیوں کے ہمراہ آرہے ہیں۔

جابر برہنہ پا، برہنہ سر روانہ ہوئے جب امام زین العابدینؑ کے قریب پہنچے تو امامؑ نے فرمایا کیا تم جابر ہو؟ عرض کی جی ہاں۔ امامؑ نے فرمایا: جابر! یہ وہ جگہ ہے جہاں ہمارے مرد مارے گئے، ہمارے بچوں کے سرتن سے جدا کیے گئے، ہماری عورتوں کو اسیر بنایا گیا۔ ہمارے خیموں میں آگ لگائی گئی۔[1]

---

[1] اعیان الشیعہ ج ۱۵/۱۳۳ بنقل از کتاب بشارۃ المصطفیٰ تالیف ابی جعفر محمد بن ابی القاسم محمد بن علی طبری، چھٹی ہجری کے علماء امامیہ میں سے تھے۔ یہاں پر دو باتوں کو ذکر کرنا ضروری ہے (۱) کتاب بشارۃ المصطفیٰ جو نجف اشرف میں چھپی ہے اس کتاب میں اور وہ کتاب جس سے اعیان الشیعہ نے روایت نقل کی ہے، فرق ہے موجودہ کتاب "بشارۃ المصطفیٰ" میں جابر اور اہل حرم کے کربلا میں آنے کا کوئی ذکر نہیں ملتا، لیکن قرائن اس بات پر گواہ ہیں کہ جو کچھ اعیان الشیعہ کے مولف عالی قدر مرحوم علامہ سید محسن امین نے نقل کیا ہے وہ صحیح اور درست ہے کیوں کہ موجودہ بشارۃ المصطفیٰ کے مقدمہ میں یہ بات واضح کر دی گئی ہے کہ کتاب کے نسخے ناقص تھے۔ اور کتاب کا ایک نسخہ جو خرم شہر میں دستیاب ہوا، موجودہ کتاب اسی خرم شہر کے نسخہ کے مطابق چھپی ہوئی ہے۔

تاریخی مطالب کو نقل کرنے میں مرحوم سید محسن امین کی دقت نظر اور حفظ امانت کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ بشارۃ المصطفیٰ کا جو نسخہ ان کے پاس تھا وہ اصل نسخہ تھا، اور انھوں نے امام حسینؑ کے اہل حرم کے کربلا میں آنے کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ اصل نسخہ کتاب کے مطابق ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ محدث عالی قدر مرحوم میرزا حسین نوری نے اپنی کتاب "لؤلؤ و مرجان" میں جو کہ اہل منبر کے آداب کے بارے میں لکھی گئی ہے، بحث کی مناسبت کو مد نظر رکھتے ہوئے جابر اور امام حسینؑ کے خاندان کے اربعین اول میں، کربلا میں وارد ہونے کا انکار کیا ہے اس سلسلے میں وہ مختلف علمی اور تاریخی دلائل بھی لائے ہیں۔ (بقیہ حاشیہ ص ۱۶۴ پر)

ستارۂ درخشاں کا غروب:

جابر جو کہ پیمان عقبہ میں شرکت کرنے والوں میں آخری فرد تھے[1] ساری عمر راہ خدا میں مجاہدہ میں گزارنے کے بعد جو کہ نوّے سال سے زیادہ ہو چکی تھی، ۷۸ھ[2] میں اس جہان فانی سے کوچ کر گئے اور خاک مدینہ میں ابدی نیند سو گئے۔

ان برادران کے ہمنواؤں پر خدا کا درود و سلام ہو جنھوں نے کفر و شرک و ستم سے لوہا لینے میں ایک لمحے بھی فروگزاشت نہیں کیا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۴۲ کا)

محدث نوری کے بعد بہت سے علما نے خصوصاً محدث نوری کے شاگردوں نے بھی اس بات کا انکار کیا ہے۔ لیکن بعض معاصر علما نے اس موضوع پر مخالفین کی دلیلوں کو رد کیا ہے اور وسیع تاریخی اور علمی تحقیقات کے ذریعہ ثابت کیا ہے کہ جابر ابن عبد اللہ انصاری نے اسی اربعین اوّل میں یعنی ۲۰ صفر ۶۱ھ کو امام کے کنبے سے جو کہ شام سے کربلا آیا تھا ملاقات کی ہے۔

یہ بحث بہت وسیع ہو گئی ہے اور اس کتاب سے ہٹ کر ہے لہٰذا اس سلسلے میں "تحقیق دربارۂ اربعین" دیکھی جا سکتی ہے۔

[1] اسد الغابہ ج ۱، ص ۲۵۸ - اعیان الشیعہ ج ۱۵، ص ۱۳۹ [2] ایضاً رجال شیخ طوسی ص ۱۲ - ۱۳۹

بزمِ آگہی

گوشۂ معلومات

قارئین کی دلچسپی اور روزمرہ کی دینی معلومات میں اضافہ کی غرض سے ہم نے مختلف اسلامی علوم سے متعلق چودہ سوالوں کا ایک گراں قدر سلسلہ شروع کیا ہے۔ جوابات مندرجہ ذیل پتہ پر قبول کیے جائیں گے۔ ان سوالات کے صحیح جوابات اگلے شمارہ میں ملاحظہ فرمائیں۔ نوے فیصد تک صحیح جوابات لکھنے والوں کی بقیدِ قرعہ انعام سے حوصلہ افزائی کی جائے گی۔

نوٹ: جوابات کے صفحہ پر خط لکھنے سے پرہیز کریں، تاکہ فائلنگ میں مشکل پیش نہ آئے۔ اور صفحہ کے ایک جانب درمیان میں سطر چھوڑ کر لکھیں۔

"پیغامِ ثقلین"۔ اہل بیت کلچرل کمپلیکس، کالندی کنج روڈ، ابوالفضل انکلیو II، (شاہین باغ) جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵-۱۱۰۰۲۵۔

- ونضع الموازین القسط لیوم القیامۃ فلا تظلم نفس شیئاً وان کان مثقال حبۃ من خردل اتینا بھا وکفیٰ بنا حاسبین
  مذکورہ آیت کا ترجمہ، سورہ اور آیت نمبر لکھیے۔
- بیٹا، نماز قائم کرو، نیکیوں کا حکم دو، برائیوں سے منع کرو اور اس راہ میں جو مصیبت پڑے،

اس پر صبر کرو کہ یہ بہت بڑی ہمت کا کام ہے۔

اصل آیت مع حوالہ کے تحریر کیجیے۔

- قرآن کریم میں "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" کا کتنی مرتبہ ذکر آیا ہے؟
- بعثتِ پیغمبر کس تاریخ میں واقع ہوئی؟
- حضورؐ نے جس موقع پر اپنے قرابت داروں کو جمع کر کے دعوتِ اسلام دی تھی، اس کو تاریخ نے کیا نام دیا ہے؟
- سب سے پہلی ہجرت کس مقام کی طرف ہوئی؟
- ہجرت کے موقع پر حضرت علیؑ کی شان میں نازل ہونے والی آیت مع سورہ اور آیت نمبر لکھیے۔
- خانۂ کعبہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنے کا حکم کس سنہ میں آیا ہے؟
- کم از کم کتنے سال کے بچے کی نمازِ میت واجب ہے؟
- "قیام متصل بہ رکوع" رکوع میں جانے سے پہلے کے قیام کو کہتے ہیں، یا رکوع کے بعد سیدھے کھڑے ہونے کو؟
- اعضاءِ سجدہ کتنے ہیں، نام لکھیے۔
- نمازِ آیات کن وجوہات سے واجب ہوتی ہے؟
- اگر کوئی شخص غروبِ آفتاب کے بعد شبِ عید مر جائے تو اس کا فطرہ دینا [مستحب] [واجب] [مباح] ہے۔
- مشہور کتاب "اعیان الشیعہ" کے مؤلف کا نام لکھیے۔

گزشتہ شمارہ کے

سوالوں کے جوابات

○ ایمان والو خدا کے لیے قیام کرنے والے اور انصاف کے ساتھ گواہی دینے والے بنو اور خبردار کسی قوم کی عداوت تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کردے کہ انصاف کو ترک کردو، انصاف کرو کہ یہی تقویٰ سے قریب تر ہے اور اللہ سے ڈرتے رہو کہ اللہ تمہارے اعمال سے خوب باخبر ہے (مائدہ/۸)

○ یاایّھا الّذین اٰمنوا لا تدخلوا بیوتا غیر بیوتکم حتّٰی تستأنسوا وتسلّموا علیٰ اھلھا ذالکم خیر لکم لعلّکم تذکّرون (نور/۲۷)

○ معاویہ

○ عسکر: حوأب

○ ماہ مبارک رمضان سنہ ۲ھ

○ جنگ صفین ۔ نوّے سال ۔

○ ۱ پاک ہو ۲ مباح ہو ۳ مردار کا جز نہ ہو ۴ حرام گوشت جانور سے نہ ہو ۵ نمازی مرد ہو تو ریشم نہ ہو ۶ سونا نہ ہو ۔

○ ۱ خون ۲ فضلہ ۳ آلۂ تناسل ۴ مادہ کا مقام پیشاب ۵ بچہ دانی ۶ غدود ۷ خصیتین ۸ وہ چیز جو گچھے کے دانوں کے مانند ہے ۹ حرام مغز جو کہ ریڑھ کی ہڈی کے دونوں طرف ہوتے ہیں ۱۰ وہ پٹھے جو ریڑھ کی

ہڈی کے دونوں طرف ہوتے ہیں ۱۱ پشت ۱۲ کی ۱۳ شانہ ۱۴ آنکھ کا ڈھیلا ۱۵ ذات الاشاجع جو سموں کے درمیان ہوتی ہے۔

○ تین ماہ

○ ۱ ایسی چیز میں شک کرنا جس کا محل و موقع گزر چکا ہو۔ ۲ نماز کے اسلام کے بعد شک کرنا ۳ وقت نماز گزر جانے کے بعد کا شک ۴ کثیر الشک کا شک ۵ پیش نماز یا مقتدی کا عدد رکعت میں شک کرنا جب کہ مقتدی یا پیش نماز کو عدد رکعات یاد ہوں ۶ مستحب نماز میں شک کرنا۔

○ سبحان اللہ والحمد للہ ولا الٰہ الا اللہ واللہ اکبر۔

○ ۱ پیشاب ۲ پاخانہ ۳ ریح جو پاخانہ کے مقام سے خارج ہو ۴ ایسی نیند جس میں آنکھ دیکھ سکے اور نہ کان سن سکے ۵ جن چیزوں سے عقل زائل ہو جاتی ہے مثلاً دیوانگی، مستی اور بے ہوشی ۶ خون استحاضہ ۷ وہ کام کہ جس کی وجہ سے غسل کرنا پڑتا ہے جیسے جنابت۔

○ شعبہ

○ ذی قعدہ سعدہ

- جسے قریبی چھوڑ دیں اُسے بیگانے مل جائیں گے۔
- جو شخص اُمید کی راہ میں بگٹٹ دوڑتا ہے وہ موت سے ٹھوکر کھاتا ہے
- باُمروّت لوگوں کی لغزشوں سے درگزر کرو (کیونکہ) ان میں سے جو بھی لغزش کھا کر گرتا ہے تو اللہ اس کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر اسے اُوپر اُٹھا لیتا ہے۔
- خوف کا نتیجہ ناکامی اور شرم کا نتیجہ محرومی ہے اور فرصت کی گھڑیاں (تیز رو) ابر کی طرح گزر جاتی ہیں لہذا بھلائی کے ملے ہوئے موقعوں کو غنیمت جانو۔
- جسے اُس کے اعمال پیچھے ہٹا دیں اُسے حسب و نسب آگے نہیں بڑھا سکتا۔
- کسی مُضطرب کی داد و فریاد سُننا اور مُصیبت زدہ کو مُصیبت سے چھٹکارا دلانا بڑے بڑے گناہوں کا کفارہ ہے۔
- بہترین زہد، زہد کا مخفی رکھنا ہے۔
- نیک کام کرنے والا خود اس کام سے بہتر اور بُرائی کا مرتکب ہونے والا خود اس بُرائی سے بدتر ہے۔
- سخاوت کرو لیکن فضول خرچی نہ کرو اور کفایت شعاری کرو مگر بخل نہیں۔
- بہترین دولت مندی یہ ہے کہ تمناؤں کو ترک کرے۔
- جو شخص لوگوں کے بارے میں جھٹ سے ایسی باتیں کہہ دیتا ہے جو انھیں ناگوار گزریں تو پھر وہ اُس کے بارے میں ایسی باتیں کہتے ہیں کہ جنھیں وہ جانتے نہیں۔
- جس نے طول طویل اُمیدیں باندھیں اُس نے اپنے اعمال بگاڑ لیے۔

(نہج البلاغہ / حکمت)

خلافت الہیہ کے عظیم منصب پر فائز ہوتا ہے اور علیؑ بن جاتا ہے جن کے بارے میں صدیوں سے کتابیں لکھی جارہی ہیں لیکن ابھی ان کی عظمت کے ایک گوشے کو بھی بیان کرنے میں کامیابی حاصل نہیں ہوئی ہے۔

خداوند عالم نے روح انسان کی تربیت اور کمال کے لیے وسائل فراہم کیے ہیں۔ منجملہ ان کے دین اور بعثتِ پیغمبر وغیرہ ہے۔ الہی نمائندے آئے تاکہ آسمانی لائحہ عمل اور الہی تعلیمات کے ذریعہ انسان کو اس کے مطلوبہ مقام و کمال تک پہنچائیں۔ روزہ اور نماز انسان سازی کا وہ نصاب ہے جو روح کو گناہ کی آلودگیوں سے پاک کرتا ہے اور اسے پاکیزگی اور معنویت عطا کرتا ہے۔ اسی طرح اور دوسری عبادتیں اپنے اپنے طور پر انسان کی تربیت اور اس کی روح کے کمال و ارتقا میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔

اخروی نعمتیں:

انسان اپنی زندگی کے ایام گزارنے اور دنیا کی بے شمار نعمتوں سے استفادہ کرنے کے بعد اس فانی دنیا سے رخصت ہوتا ہے اور دوسری دنیا میں قدم رکھتا ہے اور وہاں بھی خدا کی طرح طرح کی ان نعمتوں سے بہرہ مند ہوتا ہے جو اس نے اپنے بہترین مومن بندوں کے لیے پیدا کی ہیں۔

اس طرح کلی نعمتوں کے عناوین کے تحت الہی نعمتوں کو فہرست وار پہچانا جاسکتا ہے۔ اور آیۂ کریمہ میں جو فرمایا: "واسبغ علیکم نعمہ ظاھرۃ وباطنۃ" یہ ان ہی تمام نعمتوں کی طرف اشارہ ہے۔

ومن الناس من یجادل فی اللہ بغیر علم ولا ھدی ولا کتاب منیر۔

آیا انسان ان تمام نعمتوں کے باوجود جنھوں نے اس کی زندگی کے دامن کو مالا مال کردیا ہے اور انھیں شمار کرنے سے وہ عاجز و ناتواں ہے، ان نعمتوں کو عطا کرنے والے کو پہچانتا ہے؟ جس خدا نے زمین و آسمان کی موجودات کو اس کے قبضۂ اختیار میں قرار دیا ہے، اسے مانتا ہے، یا یہ کہ اپنے بے بنیاد اور لاطائل دلائل سے اس ذات کا انکار کرتا ہے؟

QUARTERLY **PAIGHAM-E-SALAIN**, New Delhi
Registered with the Registrar of News Papers. 57187/93
AHL-E-BAIT CULTURAL COMPLEX
Kalindi Kunj Road, Abdul Fazl Enclave II (Shaheen Bagh),
Jamia Nagar, New Delhi-110025
Tel: : 6945298
Vol 4 Issue 3 May-June-July 1997

مہجوریتِ قرآن و عترت

......رسولِ خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا مقدس وجود نظروں سے پنہاں ہو جانے کے بعد جو کچھ ان دونوں (قرآن و عترت) میں سے کسی ایک پر گزری ہے، وہ دوسرے پر بھی گزری ہے۔ ایک کی تنہائی و مہجوریت دوسرے کی تنہائی و مہجوریت ہے۔

......تمام مسلمانوں کو، جن پر حجت تمام ہو چکی ہے، اس (حدیثِ ثقلین) کا جوابدہ ہونا چاہیے۔ اگر ناواقف جاہلوں کے لیے عذر کی کوئی گنجائش ہو بھی تو مذاہب کے علماء کے لیے قطعی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

......خود غرض طاغوتیوں نے "قرآن" کو جو "حوض" تک پہنچنے کے لیے مادی و معنوی زندگی کا عظیم ترین دستور تھا اور ہے، میدان سے دور کر دیا اور حکومت عدلِ الٰہی جو اس مقدس کتاب کا ایک اہم مقصد تھا اور ہے، اس پر خطِ بطلان کھینچ دیا۔

(امام خمینیؒ کے وصیت نامہ سے اقتباس)

کبھی کبھی خالق کائنات اپنی ناشکری مخلوق سے گلہ کرتا ہے۔ سورۂ نوح میں ارشاد ہوتا ہے:

"مالکم لا ترجون للہ وقاراً"[1]

آخر تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم خدا کی عظمت کا خیال نہیں کرتے؟

اس مقام پر بھی فرماتا ہے کہ لوگوں میں بعض ایسے بھی ہیں جو علم و ہدایت اور روشن کتاب کے بغیر بھی خدا کے بارے میں بحث کرتے ہیں اور ہٹ دھرمی سے اس کے وجود کا انکار کرتے ہیں۔

چنانچہ بعض مادہ پرست افراد صرف اس بنیاد پر کہ انھوں نے اپنی تجربہ گاہوں یا طاقتور ٹیلی اسکوپوں کے ذریعہ خدا کو نہیں دیکھا، وجودِ خدا کا انکار کرتے ہیں۔ خداوندِ عالم آیۂ کریمہ کے اس حصّہ میں ایسے کافروں کی ضعیف اور بے بنیاد منطق کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ زمین اور آسمانوں کی وافر اور لامحدود نعمتوں کے ہوتے ہوئے وہ اس کے عطا کرنے والے کو پہچاننے کے لیے اپنی عقل و خرد کا استعمال نہیں کرتے اور اپنے بے بنیاد دلائل سے خوش اور مطمئن ہیں۔

(..... جاری ہے)

---

[1] نوح/۱۳

قرآنی معلومات

جنّت کی زندگی

ابدیت:

واما الّذین سعدوا ففی الجنّة خالدین فیھا مادامت السّموات والارض الّا ماشاء ربّک عطاءً غیر مجذوذ (ھود/۱۰۸)

جو لوگ نیک بخت ہیں وہ جنت میں ہوں گے اور ہمیشہ وہیں رہیں گے جب تک کہ آسمان وزمین قائم ہیں مگر یہ کہ پروردگار اس کے خلاف چاہے۔ یہ خدا کی عطا ہے جو ختم ہونے والی نہیں ہے۔

پاکیزگی قلب:

انّ المتّقین فی جنّات وعیون ادخلوھا بسلام اٰمنین ونزعنا ما فی صدورھم من غلّ اخوانا علی سرر متقابلین لایمسّھم فیھا نصب وما ھم منھا بمخرجین۔ (حجر/۴۵)

بیشک متقی لوگ باغات اور چشموں کے درمیان رہیں گے۔ انھیں حکم ہوگا کہ تم ان باغات میں سلامتی اور حفاظت کے ساتھ داخل ہو جاؤ اور ہم نے ان کے سینوں سے ہر طرح کی کدورت نکال لی ہے اور وہ بھائیوں کی طرح آمنے سامنے تخت پر بیٹھے ہوں گے۔ نہ انھیں کوئی تکلیف چھوسکے گی اور نہ وہاں سے نکالے جائیں گے۔

بہشتی لذتیں:

انّ المتّقین فی مقام امین فی جنّات وعیون یلبسون من سندس واستبرق متقابلین کذالک وزوّجناھم بحور عین یدعون فیھا بکلّ فاکھة اٰمنین لایذوقون فیھا الموت الّا الموتة الاولٰی ووقٰھم عذاب الجحیم فضلاً من ربّک ذالک ھو الفوز العظیم۔ (دخان/۵۱)

بیشک وہ صاحبانِ تقویٰ محفوظ مقام پر ہوں گے، باغات اور چشموں کے درمیان۔ وہ ریشم کی باریک اور موٹی پوشاک پہنے ہوئے ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے ہوں گے۔ ایسا ہی ہوگا اور ہم بڑی بڑی آنکھوں والی حوروں سے ان کے جوڑے لگا دیں گے۔ وہ وہاں ہر قسم کے میوے سکون کے ساتھ طلب کریں گے اور وہاں پہلی موت کے علاوہ کسی موت کا مزہ نہیں چکھنا ہوگا اور خدا انھیں جہنم کے عذاب سے محفوظ رکھے گا۔ یہ سب آپ کے پروردگار کا فضل و کرم ہے اور یہی انسان کے لئے سب سے بڑی کامیابی ہے۔

شراب و شہد:

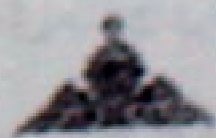
فیھا انھار من ماءٍ غیر آسن وانھار من لبن لم یتغیر طعمہ وانھار من خمر لذۃ للشاربین وانھار من عسل مصفّی ولھم فیھا من کل الثمرات ومغفرۃ من ربھم۔ (محمد/۱۵)

اس میں ایسے پانی کی نہریں ہیں جس میں کسی طرح کی بو نہیں ہے اور کچھ نہریں دودھ کی بھی ہیں جس کا مزہ بدلتا ہی نہیں ہے اور کچھ نہریں شراب کی بھی ہیں جن میں پینے والوں کے لئے لذت ہے اور کچھ نہریں صاف و شفاف شہد کی ہیں اور ان کے لئے ہر طرح کے میوے بھی ہیں اور پروردگار کی طرف سے مغفرت بھی ہے۔

موسم:

متکئین فیھا علی الارائک لایرون فیھا شمسا ولا زمھریرا ودانیۃ علیھم ظلالھا وذللت قطوفھا تذلیلا۔ (دہر/۱۳)

جہاں وہ تختوں پر تکیہ لگائے بیٹھے ہوں گے۔ نہ آفتاب کی گرمی دیکھیں گے اور نہ سردی۔ ان کے سروں پر بہشتی درختوں کا سایہ ہوگا اور میوے بالکل ان کے اختیار میں کر دیئے جائیں گے۔



محبتِ اہلِ بیت علیہم السلام

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

اساس الاسلام حبّی وحب اھل بیتی (کنز العمال / ح ۳۴۲۰۶)

میری اور میرے اہلِ بیتؑ کی محبت اسلام کی بنیاد ہے۔

پیغمبرِ اسلامؐ نے فرمایا:

حبنا اھل البیت یکفر الذنوب ویضاعف الحسنات (امالی طوسی / ص ۱۶۴)

ہم اہلِ بیتؑ کی محبت گناہوں کو ختم اور حسنات میں اضافہ کرتی ہے۔

پیغمبر اسلامؐ نے فرمایا:

اثبتکم علی الصراط اشدّکم حبًا لی ولاھل بیتی۔ (جامع الاحادیث / ص ۲۳)

جو مجھ سے اور میرے اہلِ بیتؑ سے جتنی زیادہ محبت رکھے گا صراط پر اتنا ہی ثابت قدم ہوگا۔

رسولِ اسلامؐ نے فرمایا:

لایومن عبد حتیّٰ اکون احبّ الیہ من نفسہ وتکون عترتی احبّ الیہ من عترتہ۔ (الفردوس / ح ۷۷۹۶۔ ص الشرائع ص ۱۴۰)

کسی شخص کا ایمان اس وقت تک کامل ہو ہی نہیں سکتا جب تک وہ مجھے اپنی ذات سے اور میرے خاندان کو اپنے خاندان سے زیادہ دوست نہ رکھے۔

حضرت امیر المومنین علیہ السلام نے فرمایا:

من احبنا فلیعمل بعملنا ولیتجلبب الورع۔ (غرر الحکم / ح ۸۴۸۳)

جو شخص ہمیں دوست رکھتا ہے اسے چاہیے کہ ہمارے اعمال کی پیروی کرے اور تقویٰ و پرہیزگاری اختیار کرے۔

امیر المومنینؑ نے فرمایا:

اسعد الناس من عرف فضلنا و تقرب الی اللہ بنا و اخلص حبنا (غرر الحکم / ۳۳۹۷)

سب سے زیادہ خوش قسمت وہ شخص ہے جو ہمارے مقام و منزلت کو پہچانے۔ ہمارے ذریعہ سے خدا سے قریب ہو اور ہماری محبت میں مخلص ہو۔

امام حسن علیہ السلام نے فرمایا:

انا من اھل البیت الذی افترض اللہ مودتھم علی کل مسلم (مستدرک الصحیحین جلد ۳ ص ۱۷۲)

ہم وہ اہل بیتؑ ہیں جن کی محبت خداوند عالم نے ہر مسلمان پر واجب قرار دی ہے۔

امام حسین علیہ السلام نے فرمایا:

من احبنا للہ کنا نحن وھو یوم القیامۃ کھاتین (واشار بالسبابۃ والوسطیٰ)

(معجم الکبیر / ح ۲۸۸۰)

جو ہم کو خدا کے لئے دوست رکھے گا وہ روز قیامت ہمارے ساتھ اس طرح ہوگا۔ (آپؑ نے اپنی درمیانی اور کلمہ کی انگلیوں سے اشارہ کیا)

امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا:

حبنا ایمان و بغضنا کفر (دعائم الاسلام جلد ۱ ص ۷۲)

ہماری محبت ایمان اور ہماری دشمنی کفر ہے۔

امام صادق علیہ السلام نے فرمایا:

واللہ لا یحبنا عبد حتیٰ یطھر اللہ قلبہ۔ (کافی جلد ۱ ص ۱۹۴)

خدا کی قسم کوئی بندۂ خدا ہم لوگوں کو دوست نہیں رکھتا مگر یہ کہ خدا نے اس کے قلب کو پاکیزہ بنا دیا ہو۔

امام صادق علیہ السلام نے فرمایا:

من احبنا اھل البیت و حقق حبنا فی قلبہ جری ینابیع الحکمۃ علی لسانہ۔ (محاسن ص ۶۱)

جو شخص ہم اہل بیتؑ کو دوست رکھے اور ہماری محبت اس کے دل میں گھر کر جائے تو اس کی زبان پر حکمت کے چشمے جاری ہو جاتے ہیں۔

امام رضا علیہ السلام کی ولی عہدی

جناب آیت اللہ خامنہ ای

ہمیں یہ اعتراف کرنا ہوگا کہ ائمہ طاہرینؑ کی زندگی کی صحیح طریقہ سے شناخت نہیں ہوئی ہے۔ ان کی عظمت، منزلت اور سختیوں سے بھرے جہاد حتیٰ ان کے شیعوں پر بھی پوشیدہ ہیں جبکہ اس سلسلہ میں ہر دور میں ہزاروں چھوٹی بڑی کتابیں لکھی جا چکی ہیں، لیکن ائمہ علیہم السلام کی زندگی کے ایک بڑے حصہ پر ابہام اور اجمال کا غبار پڑا ہوا ہے۔ خاندان نبوت کے برجستہ ترین افراد کی سیاسی زندگی جو کہ تاریخ اسلام کی نازک اور حساس پہلی ڈھائی صدیوں پر مشتمل ہے۔ بہت سے اہل قلم اور مؤرخین کی معرضانہ روش، بے اعتنائی اور کج فہمی کا شکار ہوئی ہے۔ اسی وجہ سے ہمارے پاس ائمہؑ کی پُر تلاطم زندگی کی مدوّن تاریخ نہیں ہے۔

امام رضا علیہ السلام کی زندگی کے تقریباً بیس سال اس نازک اور حساس مدت کا انتہائی اہم حصہ ہیں۔ جن میں غور و فکر اور ضروری تحقیق ہونی چاہیے۔

ائمہ علیہم السلام کی سوانح حیات میں جس چیز پر کما حقہ توجہ نہیں دی گئی، وہ ان حضرات کا "سیاسی جہاد" ہے۔ پہلی صدی ہجری کے نصف دوم کے آغاز سے اسلامی خلافت کھلم کھلا بادشاہت اور سلطنت میں تبدیل ہو گئی اور اسلامی امامت کی جگہ ظالمانہ بادشاہت نے لے لی تو ائمہ اہل بیتؑ

اپنے سیاسی مبارزہ میں حالات کی مناسبت سے تیزی لے آئے۔ اس جہاد کا سب سے بڑا مقصد نظام اسلامی کی تشکیل اور امامت کی بنیاد پر اسلامی حکومت کو استوار کرنا تھا۔ بے شک اہل بیتؑ کا اپنی مخصوص روش سے دین کی تفسیر اور وضاحت اور معارف و احکام اسلامی میں ہوئی تحریفوں اور کج فہمیوں کو دور کرنا بھی ان کے جہاد کا ایک اہم مقصد تھا، تاہم یقینی قرائن سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اہلبیتؑ کا جہاد صرف ان ہی مقاصد کے حصول کے لیے محدود نہیں تھا، بلکہ ان کا عظیم مقصد علوی حکومت کی تشکیل اور عادل اسلامی حکومت کی بنیاد رکھنا تھا۔ اسی ہدف اور مقصد کی بنیاد پر ائمہؑ اور ان کے اصحاب کو شدید دشواریوں اور کٹھنائیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ائمہؑ حادثۂ عاشورا کے بعد اور امام سجادؑ کے دور سے ہی ایک طویل مدتی منصوبہ کے تحت اس مقصد کے لیے راہ ہموار کرنے لگے۔

عاشورا سے لے کر امام رضاؑ کی ولی عہدی کے زمانے تک (جو ایک سو چالیس سال کا عرصہ ہے) ائمہ اہلبیتؑ اور شیعہ، حکومت کے سب سے بڑے اور خطرناک دشمن سمجھے جاتے تھے۔ اس مدت میں انھیں بہت سے مواقع فراہم ہوئے جن سے فائدہ اٹھاتے ہوئے شیعہ اپنی انقلابی تحریک میں (جسے علوی انقلابی تحریک کا نام دیا جانا چاہیے) کامیابیوں سے نزدیک ہوتے گئے، لیکن ہر بار (فیصلہ کن) کامیابی کی راہ میں کوئی نہ کوئی رکاوٹ آجاتی تھی۔ اور اس تحریک کو شدید جھٹکا اس وقت پہنچتا تھا، جب اس کے محور اور مرکز یعنی امام علیہ السلام کو قید کر دیا جاتا یا شہید کر ڈالا جاتا تھا۔ اور جب دوسرے امام (سیاسی محاذ پر) اپنی امامت کی ذمہ داریاں سنبھالتے تو حکومت کی طرف سے دباؤ اور سختی اس قدر ہوتی کہ دوبارہ انقلاب کی راہ ہموار کرنے کے لیے طویل عرصہ درکار ہوتا۔

ائمہؑ نے تشیع کو ان حادثات کی تند و تیز آندھیوں اور دشوار گزار و خطرناک راستوں سے بڑی ہوشمندی اور شجاعت سے چھوٹی لیکن گہری اور پائیدار "تحریک" کے عنوان سے نکالا۔ اور اموی اور عباسی خلفاء اماموں کو شہید کرنے میں تو کامیاب ہو گئے لیکن "امامت" کو نہ مٹا سکے اور یہ خنجر ہمیشہ حکمران خلفاء کے پہلو میں دھنسا رہا اور ان کے لیے خطرہ بنا رہا جس کی وجہ سے ان کا چین و سکون چھنتا رہا۔

مدتوں ہارون کے قید خانوں میں رہنے کے بعد جب زہر سے امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی شہادت واقع ہوئی ہے، اس وقت عباسی حکومت پر عجیب بدحواسی کا عالم طاری تھا۔ ایسے

سخت ماحول میں کہ امام موسیٰ کاظمؑ کے ایک صحابی کے بقول "ہارون کی تلوار سے خون ٹپک رہا تھا"، امام رضاؑ نے تشیع کو ان طوفانی حادثات کے گزندسے محفوظ رکھا اور اپنے پدر بزرگوار کے مددگاروں اور دوستوں کو حوصلہ شکنی اور پراگندگی سے بچایا اور تقیہ آمیز روش کے ذریعہ اپنی جان کی حفاظت کی جو کہ شیعوں کی محور و مرکز اور روح تھی اور خلفائے عباسی کی مقتدر ترین حکومت کے دوران امامت کے جہاد کو جاری رکھا۔ ہارون کی خلافت کے دوران امام رضاؑ کی زندگی کے دس سال اور بغداد و خراسان میں خانہ جنگیوں کے پانچ سال کے دوران، تاریخ امام رضاؑ کی واضح تصویر پیش کرنے سے قاصر ہے لیکن غور کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس مدت میں بھی امام رضا علیہ السلام مذکورہ اہداف اور مقاصد کے ساتھ اہلبیتؑ کے طویل مدت کے جہاد میں مشغول تھے جو عاشورا کے بعد سے تمام ائمہؑ نے جاری رکھا تھا۔

۱۹۸ھ میں مامون کو امین کے خلاف اقتدار کی جنگ میں کامیابی ملی اور وہ بلا شرکت غیرے اقتدار پر قابض ہو گیا۔ اقتدار حاصل کرنے کے بعد اس نے سب سے پہلے اپنی توجہ علویین کی تحریک کو مہار کرنے کی طرف مرکوز کی! مامون کے پاس اس کام کو انجام دینے کے لیے گزشتہ خلفاء کے تجربے بھی تھے جو علویوں کی انقلابی حرکت کی وسعت، گیرائی اور روز بروز بڑھتی ہوئی قوت کی نشاندہی کرتے اور ساتھ ساتھ اس بات پر بھی دلالت کرتے کہ اس تحریک کو اکھاڑ پھینکنے یا کم از کم کمزور اور کنٹرول کرنے کی طاقت خلافتی مشینری میں نہیں ہے۔ امام رضا علیہ السلام دیکھ رہے تھے کہ ہارون اپنی ساری سطوت و حشمت کے ساتھ امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کو قید کر کے اور آخر کار شہید کر کے بھی شیعوں کی تحریک۔ ان کی شورشوں، سیاسی اور مسلحانہ جد و جہد اور تبلیغاتی و فکری فعالیتوں کو نہیں روک سکا۔

مامون کے پاس اب جب کہ اپنے باپ دادا کا اقتدار نہیں رہ گیا تھا اور وہ دیکھ رہا تھا کہ بنی عباس میں خانہ جنگی اس کی حکومت کے لیے بڑی سخت مشکلات کا سبب بن رہی ہیں، لہٰذا اس کے لیے یہ ضروری تھا کہ وہ علویوں کی تحریک کے خطرہ کا بہت سنجیدگی سے جائزہ لیتا۔

شاید مامون شیعوں کی طرف سے خطرہ کا جائزہ لینے میں واقع بینی سے کام لے رہا تھا۔ غالباً خیال یہی کیا جاتا ہے کہ امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی شہادت کے بعد پندرہ سالہ مدت اور خصوصاً خانہ جنگی

کے باعث پانچ سال کی اور مدت شیعوں کے حق میں حکومت علوی کے قیام کے لیے بہت مفید ثابت ہوئی۔ مامون نے بہت ہوشیاری سے اس خطرہ کا اندازہ لگالیا اور اس کا سدباب کرنے کے لیے تیار ہوگیا۔ اس تشخیص اور تجزیہ کے نتیجہ میں اس نے امام رضا علیہ السلام کو مدینہ سے خراسان آنے کی دعوت دی اور ولی عہدی قبول کرنے پر مجبور کیا۔ یہ واقعہ جو کہ امامت کے طولانی دور میں کم نظیر بلکہ بے نظیر تھا، وجود میں آیا۔

یہاں اس واقعہ پر مختصر بحث کی جائے گی۔ اس واقعہ میں امام رضا علیہ السلام کو ایک عظیم تاریخی آزمائش اور امتحان سے گزرنا تھا۔ یہ ایک طرح سے پس پردہ سیاسی جنگ کے میدان میں لائے گئے تھے جس کے مثبت یا منفی نتائج 'تشیع' کے لیے فیصلہ کن تھے۔

اس لڑائی میں تمام وسائل اور ذرائع اور ہتھکنڈے، حریف کے ہاتھ میں تھے۔ مامون نے سرشار عقل و ہوش قوی تدبیروں اور فہم و درایت کے ساتھ، جو پیشرو (خلفاء میں) دیکھنے میں نہیں آئی تھیں اس میدان میں قدم رکھا تھا۔ اگر وہ اس جنگ میں جیت جاتا تو جو کچھ اس نے منصوبہ بنایا تھا اسے انجام تک پہنچاتا اور یقیناً وہ مقصد حاصل کر لیتا جو سکنہ ہو یعنی علی ابن ابی طالبؑ کی شہادت کے بعد سے اموی اور عباسی خلفاء کو نہایت کوششیں کرنے کے باوجود حاصل نہ ہوسکا تھا، یعنی مامون کو تشیع کی بیخ کنی کرنے کا موقع مل جاتا اور مخالف تحریکوں کو جو ہمیشہ طاغوتی غلاموں کی آنکھ کا کانٹا ہی ہوئی تھیں، کالعدم نیست و نابود کردیتا۔

امام رضا علیہ السلام نے اپنی تدبیر کے ذریعہ مامون کو زیر کیا اور اسے سیاسی جنگ کے میدان میں، جو اسی کا ہموار کیا ہوا تھا، مکمل اور فاش شکست دی۔ اس کے نتیجہ میں نہ تشیع ضعیف ہوا اور نہ اس کی ریشہ کنی ہوئی۔ بلکہ آپ کی ولایت عہدی کا سال تاریخ شیعیت کے لیے پربرکت ترین سال ثابت ہوا اور علویوں کی تحریک میں تازہ جان آگئی۔ یہ تمام برکتیں امام رضا علیہ السلام کی الٰہی تدبیروں اور حکیمانہ روش کا نتیجہ تھیں جنھیں آپؑ اس عظیم آزمائش میں بروئے کار لائے تھے۔

اس عجیب و غریب حادثہ کو سمجھنے کے لیے مختصر طور پر مامون کی اور امام رضا علیہ السلام کی تدبیروں کی وضاحت کرنا ضروری ہے۔

امام رضا علیہ السلام کو مدینہ سے خراسان بلا کر مامون چند اہم مقاصد حاصل کرنا چاہتا تھا:

پہلا مقصد: یہ مقصد سب سے اہم تھا۔ مامون چاہتا تھا کہ شیعوں کی فعال انقلابی تحریک کو ایک بے خطر ہلکی پھلکی سیاسی فعالیت میں تبدیل کر دے۔ جیسا کہ بتایا جا چکا ہے کہ شیعہ حالت تقیہ میں انتھک اور مسلسل جدوجہد میں مصروف تھے۔ ان کی جدوجہد میں دو خصوصیتیں تھیں جو حکومت کا تختہ پلٹنے میں واضح طور پر مؤثر تھیں۔ پہلی خصوصیت مظلومیت تھی۔ دوسری قداست۔

شیعہ ان دو عوامل پر تکیہ کر کے افکار تشیع، جو ائمہ اہل بیت کے نقطہ نظر سے اسلام کی وضاحت اور تفسیر ہے، لوگوں تک پہنچایا کرتے تھے اور جس شخص میں بھی ان افکار کو اپنانے کی ذرا سی آمادگی پاتے اسے پوری طرح اپنا ہمنوا بنا لیتے۔ اسی وجہ سے روز بروز تشیع کا دائرہ وسیع ہوتا گیا۔ شیعوں کی اسی مظلومیت اور قداست کے سبب حکومت کے خلاف جگہ جگہ پر مسلحانہ قیام اور منظم طریقہ سے شورشیں ہوا کرتی تھیں۔ مامون چاہتا تھا کہ ایک ہی جھٹکے میں خفا اور استتار کو شیعوں سے چھین لے اور امام کو انقلابی جدوجہد کے میدان سے سیاست میں کھینچ لے۔ اس طریقہ سے وہ شیعی تحریک کے اثرات کو، جو اختفا اور استتار کی بنا پر روز بروز ترقی کر رہی تھی، قطعاً کم کر دینا چاہتا تھا۔ مامون اپنے اس اقدام سے شیعوں کے دامن کو ان کی مذکورہ خصوصیتوں سے، جو نہایت مؤثر اور رسوخ پیدا کرنے والی تھیں، خالی کر دیتا۔ کیونکہ ایسی جماعت جس کا رہبر خلافتی مشینری کا ممتاز فرد ہو اور مطلق العنان بادشاہ کا ولی عہد ہو اور مملکت کے امور میں دخل رکھتا ہو، نہ تو مظلوم ہو سکتا ہے اور نہ مقدس۔

یہ تدبیر تشیع کو بھی دیگر عقائد و مکاتب فکر کی صف میں لے آتی جن کے مملکت میں بہر حال کچھ طرفدار تھے اور تشیع کو اس حکومت مخالف طرز فکر سے خارج کر دیتی جو حکومتوں کے غیظ و غضب کا نشانہ ضرور تھی لیکن عوام، خصوصاً ضعیف و مظلوم افراد کے لیے بے پناہ کشش اور جاذبیت رکھتی تھی۔

دوسرا مقصد: مامون کا دوسرا مقصد یہ تھا کہ وہ اس ولایت عہدی کے ذریعے شیعوں کے اس دعوے کو کہ اموی اور عباسی خلافتیں غاصب ہیں، غلط ثابت کرنا چاہتا تھا۔ مامون اپنی شاطرانہ چال کے ذریعے سارے شیعوں کو یہ بتانا چاہتا تھا کہ صاحب اقتدار خلافتوں کے بارے میں ان کا ہمیشہ کا عقیدہ کہ یہ سب غاصب ہیں، ایک بے بنیاد دعویٰ اور کمزوری و ناتوانی اور احساس کمتری کی بدولت ہے۔ کیونکہ اگر ساری گزشتہ خلافتیں ناجائز اور غاصب تھیں تو مامون کی خلافت ان ہی

خلافتوں کا سلسلہ ہے وہ ناجائز اور غاصبانہ ہے۔ لیکن امام رضاؑ اس خلافت میں حصہ لے کر اور اس کی ولی عہدی اور جانشینی قبول کر کے، اسے قانونی اور جائز جانیں گے لہٰذا گزشتہ ساری خلافتیں بھی جائز ہو جائیں گی۔ اس طرح شیعوں کے سارے دعوے جھوٹے ثابت ہو جائیں گے۔ مامون اس طرح سے امام رضا علیہ السلام کے ذریعہ نہ صرف اپنی حکومت، بلکہ گزشتہ خلافتوں کے بھی صحیح ہونے کا اقرار لے لیتا اور شیعوں کے عقائد میں سے ایک رکن یعنی ان حکومتوں کا غاصب اور ظالم ہونا، منہدم کر دیتا۔ اس کے علاوہ شیعوں کا دوسرا دعویٰ کہ ائمہ نہایت پارسا اور دنیا کی طرف سے بے اعتنا ہیں، دھڑام سے گر جاتا۔ اور ایسا محسوس ہوتا کہ یہ حضرات صرف موقع فراہم نہ ہونے کی وجہ سے دنیاداری سے پرہیز کیا کرتے تھے اور اب جبکہ دنیا حاصل کرنے کا موقع انھیں مل گیا ہے یہ اس کی طرف دوڑ پڑے اور دوسروں کی طرح اس کی نعمتوں سے استفادہ کرنے لگے۔

تیسرا مقصد: مامون اس کام (ولایت عہدی) کے ذریعہ امام رضاؑ کو جو کہ شیعوں کی جدوجہد کا مرکز تھے، اپنی حکومت کی مختلف مشنریوں کے کنٹرول کے تحت رکھتا اور امامؑ کے علاوہ شیعوں میں دیگر انقلابیوں اور بزرگ شخصیتوں کو اپنے کنٹرول میں لے آتا۔ یہ ایسی کامیابی ہوتی جو مامون سے پہلے کسی بھی اموی یا عباسی خلیفہ کو نصیب نہیں ہوئی تھی۔

چوتھا مقصد: مامون، امامؑ کو جو کہ عوام کے مسیحا اور مرجع تھے اور ہمیشہ عوام الناس کے درمیان رہا کرتے تھے، اپنی حکومت کے کارندوں کے محاصرہ میں رکھتا تاکہ رفتہ رفتہ آپ کی عوامی محبوبیت ختم ہو جائے اور آپ عام لوگوں سے دور ہوتے جائیں اور ان کی محبتوں سے بھی محروم ہو جائیں۔

پانچواں مقصد: مامون اس کام سے مقدس حیثیت حاصل کر لیتا کیونکہ ظاہر ہے ان دنوں سارے لوگ اس کی تعریف کرتے کہ اس نے پیغمبرؐ کی اولاد میں سے ایک مقدس شخصیت کو اپنا جانشین اور ولی عہد بنایا ہے اور اپنے بھائیوں اور بیٹوں کو اس امر سے محروم رکھا ہے۔ نیز ہمیشہ یہ ہوتا ہے کہ دنیاداروں سے دین داروں کی نزدیکی، دنیاداروں کی عزت میں اضافہ کرتی ہے اور دین داروں کی وقعت اور حیثیت کو گرا دیتی ہے۔

چھٹا مقصد: مامون کی سوچ کے مطابق امام رضاؑ ولی عہدی قبول کرنے کے بعد حکومت کے کاموں کی توجیہ کرنے والی شخصیت میں تبدیل ہو جاتے۔ ظاہر سی بات ہے امام رضاؑ جو کہ فرزند رسولؐ ہیں

اور آپ کی عظمت ہر خاص و عام پر ظاہر ہے، اگر آپ حکومت کے کاموں کی توجیہ اور تاویل کرنے لگتے تو کسی قسم کی مخالفت حکومت کو ذرہ برابر نقصان نہیں پہنچا سکتی تھی۔ یہ امر ایک ایسا سخت اور مستحکم حصار ہوتا جس میں حکومت کی ہر برائی اور غلطی چھپ جاتی۔

ان مقاصد کے علاوہ بھی مامون کے پیش نظر بہت سی چیزیں تھیں۔ جیسا کہ ظاہر ہے، یہ تدبیر اس قدر پیچیدہ اور گہری تھی، یقیناً مامون کے علاوہ کوئی اسے عملی جامہ نہیں پہنا سکتا تھا۔ اسی وجہ سے مامون کے مقرب لوگ اور دوستوں کو بھی اس کے پہلوؤں اور نتیجوں کا علم نہ تھا بعض تاریخی شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ فضل بن سہل کو بھی اس امر کا علم نہ تھا جبکہ وہ وزیر اور فوج کا سپہ سالار اور مامون کا قریب ترین فرد تھا۔ مامون اپنے مقاصد میں کسی طرح کا نقصان اٹھانا نہیں چاہتا تھا۔ اسی وجہ سے ولی عہدی کے اسباب وعلل کے سلسلہ میں جھوٹی باتیں گڑھ کر بیان کیا کرتا تھا۔

یہ اعتراف کرنا ہوگا کہ مامون کی سیاست بے مثال پختگی اور گہرائی کی حامل تھی، لیکن یہ بھی خیال رہے کہ اس کا واسطہ امام رضا علیہ السلام سے تھا، جنھوں نے مامون کی شیطنت آمیز زیرکی اور ہر جہت سے پختہ تدبیروں کو بے اثر اور بازیچۂ اطفال بنا دیا۔ مامون کو اپنی زحمتوں اور عظیم سرمایہ گذاری کا رتی برابر فائدہ نہ پہنچا، بلکہ اس کی ساری سیاستوں کا اُلٹا اثر ہوا۔ مامون جن ہتھیاروں سے امام کے اعتبار اور حیثیت پر حملہ کرنا چاہتا تھا خود ہی ان کا نشانہ بن گیا اور کچھ مدت گزرنے کے بعد اس نے بھی وہی روش اختیار کر لی جو اس کے اسلاف نے کی تھی یعنی "قتل"!

مامون نے اپنے آپ کو مقدس، عقلمند اور برحق خلیفہ بنا کر پیش کرنے کی ساری کوششیں کر ڈالیں (ان کوششوں کے ذریعہ اسے ان امور کے حصول کی قوی امید بھی تھی) لیکن سرانجام وہ کامیاب نہ ہوسکا۔ ظلم و کبر و غرور اور ان کاموں میں مشغول ہوگیا جو اس کے پہلے کے خلفاء کیا کرتے تھے۔

ولایت عہدی کے واقعہ میں مامون کی ریاکاری کے راز فاش ہونے کا عمل اس واقعہ کے بعد مامون کی پندرہ سالہ زندگی میں دسیوں موارد میں روشن ہے۔ منجملہ ان میں سے ایک مامون کا یحییٰ بن اکثم جیسے فاسق و فاجر اور عیاش آدمی کو قاضی القضاۃ کا عہدہ دینا اور اپنے گویّے چچا ابراہیم بن مہدی کے ساتھ عیش و نوش کی محفلیں سجانا وغیرہ ہے۔

ولی عہدی کے بارے میں امامؑ کا سیاسی عمل:

۱۔ امام رضا علیہ السلام کو جب مدینہ سے خراسان کی طرف آنے کی دعوت دی گئی تو امامؑ نے اپنی ناراضگی کا اظہار کیا اور مدینہ کے ماحول میں اس سفر سے اپنی ناخوشی اور اکراہ کو اپنے بیان سے عام کر دیا۔ اس سے ان تمام افراد کو مامون کی بری نیت کا پتہ چل گیا جنھیں وہ اپنے اس اقدام سے اپنا ہم نوا اور امامؑ کا مخالف بنانا چاہتا تھا کہ مامون کی نیت اچھی نہیں ہے اور وہ امامؑ کو وطن سے دور کرنا چاہتا ہے۔ امامؑ نے مامون کے خلاف ہر طرح سے اپنی بدبینی کا اظہار کیا اور ہر ممکن طریقے سے عوام تک اپنی آواز پہنچائی۔ جیسے کہ حرم پیغمبر سے وداع ہوتے وقت اور اپنے خاندان سے رخصت ہوتے ہوئے اور کعبہ کے الوداعی طواف میں۔ نیز دعاؤں اور بول چال میں ہر طرح سے سب پر واضح کر دیا کہ یہ سفر ان کی شہادت کا سبب ہے۔ مامون کے منصوبہ کے مطابق (ولی عہدی کو قبول کرنے کے لیے) امامؑ کے اس سفر سے لوگ اُس سے خوش ہو جاتے اور امامؑ سے بدظن ہو جاتے۔ لیکن ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔ اس سفر کی ابتدا ہی سے لوگوں کے دل میں مامون کی نفرت بیٹھ گئی کہ وہ ظالمانہ طریقے سے ان کے امام کو جدا کر رہا ہے اور قتل گاہ میں لے جا رہا ہے۔

۲۔ 'مرو' میں جب آپؑ کے سامنے ولی عہدی قبول کرنے کی پیشکش کی گئی تو آپؑ نے شدت سے انکار کیا۔ یہاں تک کہ مامون نے آپؑ کو قتل کی دھمکی دی۔ اس پر آپؑ نے یہ بات قبول کی۔ یہ بات ہر جگہ گردش کرنے لگی کہ علی ابن موسی الرضاؑ نے مامون کی طرف سے شدید اصرار کے بعد بھی ولی عہدی اور خلافت کی پیش کش کو ٹھکرا دیا ہے۔ خلافت کے کارندے جنھیں مامون کی تدبیر کی گہرائی کا علم نہ تھا، ہر جگہ امامؑ کے ولی عہدی کو ٹھکرا دینے کی بات پھیلاتے پھر رہے تھے حتیٰ کہ فضل بن سہل نے حکومت کے بعض کارندوں سے کہا:

> "میں نے خلافت کو اتنا ذلیل و خوار ہوتے کبھی نہیں دیکھا ہے۔ امیر المومنین (مامون) نے اس کی پیش کش علی ابن موسی الرضاؑ کو کی، اور انھوں نے اسے ٹھکرا دیا۔"

امام علیہ السلام خود، اس منصب کے آپؑ پر زبردستی تھوپے جانے کے بارے میں ہر جگہ اور ہر مناسب موقع پر بیان کرتے تھے۔ آپؑ فرماتے تھے:

"مجھے قتل کی دھمکی دی گئی۔ اس وجہ سے میں نے ولی عہدی قبول کی۔"

ظاہر ہے کہ اس بات (امامؑ کے انکار) کا حیرت انگیز سیاسی حادثہ کے عنوان سے مملکت کے کونے کونے اور ہر فرد کی زبان پر ہونا ضروری تھا تا کہ اسلامی مملکت میں بسنے والے اس زمانے کے یا آئندہ لوگ اس بات سے واقف ہو جائیں کہ اس وقت مامون جیسے شخص، جو اپنے بھائی امین کی ولی عہدی سے معزول کیے جانے کی بنا پر کئی سال تک جنگ کرتا ہے اور اپنے بھائی سمیت ہزاروں لوگوں کو اس کی خاطر قتل کروا سکتا ہے اور اپنے بھائی کے کٹے ہوئے سر کو شہروں میں تشہیر کرا سکتا ہے، ایسے شخص کی ولی عہدی کو علی ابن موسیٰ الرضا اعتبار کی نظروں سے نہیں دیکھتے، اور قتل کیے جانے کی دھمکی ملنے پر ہی از راہِ مجبوری اسے قبول کرتے ہیں۔ اس صورت حال کے پیش نظر امام رضاؑ اور مامون کے درمیان مقابلہ کا نتیجہ مامون کے تخمینوں کے بالکل برعکس نکلتا ہے جن پر مامون نے کثیر سرمایہ گزاری کی تھی۔

۳۔ امام رضا علیہ السلام نے، اس شرط کے ساتھ ولی عہدی قبول کی تھی کہ وہ حکومت کا کوئی کام انجام نہیں دیں گے، جیسے صلح، جنگ، عزل، نصب اور تدبیر امور وغیرہ۔ مامون نے یہ سوچ کر کہ اس امر کی ابتدا میں یہ شرط برداشت کی جا سکتی ہے اور بعد میں دھیرے دھیرے امامؑ کو حکومت کے کاموں میں لے آیا جائے گا، امامؑ کی اس شرط کو قبول کر لیا۔ واضح اور روشن ہے کہ اس شرط کی پوری طرح پابندی ہو جانے سے مامون کے سارے ہتھکنڈے دھرے رہ گئے۔ اور وہ اپنے اکثر مقاصد کے حصول میں ناکام و نامراد رہا۔ امامؑ اس حالت میں جبکہ برائے نام ولی عہد تھے اور ناگزیر طور پر حکومت سے ان کا ظاہری ربط بھی تھا، ایسا موقف اختیار کیے ہوئے تھے جس سے حکومت کی مخالفت ظاہر اور عیاں تھی۔ نہ آپ کے پاس کوئی عہدہ تھا، نہ کسی کام کی ذمہ داری۔ نہ آپ حکومت کا دفاع کرتے تھے اور نہ ہی اس کے کسی کام کی توجیہ کرتے تھے۔ ظاہر سی بات ہے حکومت کی مشینری کا کوئی فرد اپنے اختیار و ارادہ کے باوجود اس طرح ساری ذمہ داریوں سے کنارہ کش رہے تو وہ حکومت کا طرفدار اور اس کے حق میں سنجیدہ نہیں خیال کیا جاتا۔ مامون اس کمی کو محسوس کرتا تھا۔ اسی وجہ سے اس نے امامؑ کو ولی عہد بنانے کے بعد بار ہا امامؑ کی شرط کی مخالفت کرتے ہوئے امامؑ کو مختلف حیلوں سے حکومت کے کاموں میں کھینچنا چاہا کہ جس کے نتیجہ میں امامؑ کی منفی جد و جہد کے اثرات ختم ہو جائے۔

لیکن امام رضاؑ نے ہر بار بڑی ہوشیاری سے اس کی چالوں کو ناکام بنادیا۔ اس کا ایک نمونہ یہ ہے کہ معمر بن خلاد امام رضا علیہ السلام سے نقل کرتے ہیں کہ مامون نے امامؑ سے کہا کہ جن علاقوں کے سیاسی حالات ابتر ہیں، وہاں امامؑ اپنی بات ماننے والوں کو خط لکھ دیں۔ امامؑ نے انکار کیا اور کسی بھی کام میں دخالت نہ کرنے کی اپنی شرط کی یاددہانی کرائی۔

ایک اور اہم واقعہ نمازِ عید کا ہے۔ مامون نے اس بہانے سے کہ "عوام آپ کی عظمت سے آگاہ ہوں اور ان کے دل مطمئن ہو جائیں" امام رضاؑ سے نمازِ عید پڑھانے پر اصرار کیا۔ امام علیہ السلام نے انکار کیا۔ لیکن جب مامون کا اصرار بہت بڑھا تو امامؑ اس شرط پر نماز پڑھانا قبول کرتے ہیں کہ وہ رسول اللہؐ اور علی ابن ابیطالبؑ کی روش پر نمازِ عید کی امامت کریں گے۔ اور اس موقع سے ایسا فائدہ اٹھاتے ہیں کہ مامون اپنے اصرار پر خود ہی کفِ افسوس ملنے لگتا ہے اور امامؑ کو بیچ راستہ سے واپس بلانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ مامون اپنے اس کام سے اپنی ریاکارانہ حکومت پر ایک اور ضرب لگاتا ہے۔

۴۔ ان امور کے علاوہ امام رضاؑ نے ولی عہدی سے جو اصل فائدہ حاصل کیا ہے وہ بہت عظیم اور اہم ہے۔ امام رضاؑ نے ولی عہدی قبول کر کے ایسا عظیم کام کیا ہے جو ۴۰ھ میں حضرت علیؑ کی خلافت کے اختتام سے اس دن تک اور دورانِ خلافت کے اختتام تک بے مثال تھا۔ یہ کام شیعی امامت کے دعوے کو عالمِ اسلام کی سطح پر برملا کرنا، تقیہ کے دبیز پردوں کو ہٹانا اور سارے عالمِ اسلام میں تشیع کا پیغام پہنچانا تھا۔ امامؑ کے اختیار میں اس وقت خلافت کا عظیم اسٹیج تھا جس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے امام رضاؑ نے وہ ساری باتیں علی الاعلان کہیں جو کہ ڈیڑھ سو سال تک پس پردہ "تقیہ" میں خاص الخاص لوگوں ہی سے بیان کی جاتی تھیں۔ امام رضاؑ نے لوگوں تک اپنی آواز پہنچانے کے لیے ان تمام امکانات سے استفادہ کیا جو صرف خلفاء یا ان کے بہت قریبی لوگوں کے اختیار میں ہوا کرتے تھے۔ مامون کے دربار میں علماء سے امام رضاؑ کے مناظرات، جن میں آپ نے اثباتِ امامت میں مستحکم ترین دلیلیں پیش کیں۔ فضل بن سہل کے نام 'جوامع الشریعہ' نامی مکتوب میں آپ نے شیعہ فقہی اور عقیدتی اہم مسائل کا ذکر کیا ہے۔ 'مرو' میں عبدالعزیز بن مسلم سے امامت کے بارے میں مشہور حدیث بیان فرمائی۔ ولی عہدی کی مناسبت سے جو قصائد آپؑ کی شان میں کہے گئے، جیسے 'دعبل' اور 'ابونواس' کے قصیدے، جن کا عربی کے عظیم شہپاروں میں ہمیشہ شمار ہوگا، آپؑ کی عظیم کامیابی کی دلیل ہیں۔

اس سال مدینہ میں اور بہت سے شہروں میں جب آپؑ کی ولی عہدی کی خبر پہنچی، تو خطبوں میں اہلبیتؑ کے فضائل بیان کیے جانے لگے۔ اہلِ بیتِ پیغمبرِ اسلام جن پر ستر برس تک منبروں سے کھلم کھلا سب وشتم کیا جاتا رہا تھا اور مدتوں کسی میں ان کے فضائل بیان کرنے کی جرأت نہیں ہوئی، اب ہر جگہ انھیں عظمت اور نیکی سے یاد کیا جا رہا تھا۔ اہل بیتؑ کے دوستوں کے اس واقعہ سے حوصلے بلند ہوئے اور قوتِ قلب حاصل ہوئی۔ ناآگاہ اور بے اعتنا افراد ان سے آشنا ہو گئے اور آپؑ کی طرف مائل ہو گئے۔ شدید دشمنوں کو کمزوری اور ناتوانی کا احساس ہونے لگا۔ شیعہ محدثین اور علماء نے وہ تمام باتیں جو صرف پسِ پردہ بیان کی جا سکتی تھیں، اپنے درسی جلسوں اور عمومی اجتماعات میں کھل کر بیان کرنی شروع کر دیں۔

۵۔ مامون چاہتا تھا کہ امامؑ عوام سے الگ رہیں اور یہ جدائی امام اور عوام کے بیچ معنوی اور جذباتی (عاطفی) رشتہ کو ختم کرنے کا سبب بن جائے، لیکن امام ہر موقع پر عوام سے رابطہ برقرار رکھتے تھے۔ مامون نے مدینہ سے مرو تک کا راستہ اس طرح معین کیا تھا کہ آپؑ کے راستہ میں وہ شہر نہ پڑیں جو محبتِ اہل بیتؑ کے لیے مشہور ہیں، جیسے کوفہ و قم وغیرہ۔ امامؑ نے حکومت کی طرف سے اس معین شدہ راستہ میں بھی عوام سے رابطہ قائم کرنے کے موقعوں سے استفادہ کیا۔ اہواز میں آیاتِ امامت سنائیں۔ بصرہ والے جو آپ سے روگرداں تھے، انھیں اپنی طرف ملتفت کیا۔ نیشاپور میں حدیثِ سِلسِلَۃُ الذَّھب، کو ہمیشہ کے لیے یادگار بنا دیا۔ اس کے علاوہ اور بہت سی معجزاتی علامتیں واضح کیں اور اس لمبے سفر میں لوگوں کی ہدایت و ارشاد کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ اور مرو میں بھی جو اس وقت کا دارالسلطنت، خلافت کی منزل اور اصل اقامت گاہ تھی، جب بھی موقع ملتا آپ عوام الناس کے لیے حکومت کے حصار کو توڑ دیتے۔

۶۔ امامؑ کے ولی عہدی قبول کرنے کے بعد آپؑ نے انقلابی شیعوں کو خاموش ہو جانے کا حکم نہیں دیا، بلکہ قرائن اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ یہ لوگ امام کو اس منصب پر دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور وہ انقلابی شیعہ جو مدتِ دراز سے دشوار گزار پہاڑیوں اور دور دراز کی آبادیوں میں جا کر بس گئے تھے اور بڑی کٹھن زندگی گزار رہے تھے، وہ امامؑ کی حمایت کے تحت واپس آ گئے اور مختلف شہروں میں مقیم ہو گئے اور حکومت کے کارندوں نے بھی ان سے عزت و احترام سے پیش آنا شروع کر دیا۔ حکومت کے مخالف تیز زبان شاعر دعبل خزاعی کہ جو کبھی کسی خلیفہ، وزیر اور امیر سے راضی نہیں

رہے اور کبھی حکومت میں حصہ نہیں لیا اور حکومت کا موافق کوئی فرد بھی ان کے نشتر زبان سے نہیں بچ پایا۔ ان ہی امور کی بنا پر حکومت ہمیشہ ان کی گھات میں لگی رہتی تھی اور آپ مدتوں مختلف شہروں اور آبادیوں میں سرگرداں رہے اور گویا اپنا سر ہتھیلی پہ لیے پھرتے رہے۔ وہی دعبل خزاعی امام رضاؑ کے ولی عہدی قبول کرنے کے بعد آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنا بہترین اور مشہور قصیدہ جس کو بجا طور پر عباسی اور اموی خلافتوں کے خلاف علوی تحریک کا ادعانامہ کہا جاسکتا ہے، امامؑ کی خدمت میں پیش کیا۔ یہ قصیدہ بہت کم مدت میں ساری اسلامی دنیا میں پہنچ گیا اور ایسا مشہور ہوا کہ جب دعبل امامؑ کی خدمت سے رخصت ہو کر واپس لوٹ رہے تھے تو انہوں نے ڈاکوؤں کے سردار کی زبان سے اپنا کہا ہوا قصیدہ سُنا۔

ولی عہدی کے ایک سال بعد اس نہایاں جنگ کے میدان پر نظر دوڑائیں جسے مامون نے خود اپنے ایجاد کردہ طریقوں سے آراستہ کیا تھا، اور ان مقاصد کے حصول کے لیے جن کی طرف اشارہ کیا جا چکا ہے، امام رضاؑ کو بھی اس میں زبردستی لے آیا، مندرجہ ذیل نتائج حاصل ہوئے ہیں:

مامون نے امام رضاؑ کو بے حد وسیع امکانات و اختیارات دے رکھے تھے اور بے انتہا آپؑ کی عزت کرنے لگا تھا۔ لیکن سب کو اس بات کا علم تھا کہ آپؑ حکومت کے سارے کاموں سے کنارہ کش رہتے ہیں اور آپؑ نے ولی عہدی اسی شرط پر قبول کی ہے۔

مامون ولی عہدی کے فرمان نامہ میں اور اپنی تحریر اور تقریر میں ہمیشہ امامؑ کے فضل و علم و تقویٰ اور اعلیٰ نسب کی تعریف کیا کرتا تھا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ آپ ان لوگوں کی نظر میں بھی، جو آپؑ سے واقف نہیں تھے، یا جنھوں نے صرف آپ کا نام سن رکھا تھا، یا آپؑ کی نسبت دل میں کینہ لیے ہوئے تھے، قابل تعظیم و احترام بن گئے اور ان لوگوں نے آپ کو ایسی شخصیت کے عنوان سے پہچانا جو خلافت کے لائق ہے اور خلیفہ سے عمر، علم و تقویٰ میں زیادہ ہے اور پیغمبرؐ سے رشتہ داری میں قریب تر ہے۔ مامون امامؑ کے ہوتے ہوئے شیعہ مخالفین کو راضی نہ کر پایا اور ان کی تیز زبانوں کو اپنی شخصیت اور خلافت پر حملے کرنے سے نہ روک پایا، بلکہ امام رضا علیہ السلام کی وجہ سے ان انقلابیوں کو اطمینان اور امان حاصل ہوا اور ان کے حوصلوں کو استحکام ملا۔ مدینہ اور مکہ اور دیگر اہم شہروں میں، آپؑ کے ولی عہدی قبول کرلینے سے آپؑ پر نہ دنیا کی حرص اور مقام و منصب

کی چاہت کا الزام لگ پایا (جیسا کہ مامون چاہتا تھا) اور نہ آپ کی عظمت و تقدس پر کوئی حرف آیا۔ بلکہ مزید آپ کی حشمت و عظمت اور تقدس میں اضافہ ہوا اور ایک مدتِ دراز گزر جانے کے بعد لوگ آپ کے اور آپ کے معصوم و مظلوم آبار کے فضل و کمال کے گن گانے لگے مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس جوئے میں مامون کو کچھ حاصل ہونا تو در کنار وہ بہت کچھ ہار بیٹھا اور بقیہ چیزوں کے ہاتھ سے چلے جانے کے اندیشہ میں دن گزارنے لگا۔

یہاں سے مامون کو اپنی شکستِ فاش اور نقصان کا احساس ہوا اور اپنی غلطیوں کی تلافی کی راہیں نکالنے لگا۔ اسے یہ احساس ہوا کہ اس قدر عظیم سرمایہ گذاری کے باوجود اس خلافت مشینریوں کے سخت مخالف۔ یعنی ائمہ اہلِ بیت سے مقابلہ کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے جو اس سے پہلے ظالم اور جابر خلفار نے اپنایا تھا، یعنی قتل کر دینا۔

ظاہر سی بات ہے امام رضا علیہ السلام جو نہایت ممتاز حیثیت کے مالک تھے، کو قتل کرنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ تاریخی قرائن اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ مامون نے اپنے حتمی ارادہ کو جامۂ عمل پہنانے سے پہلے کچھ ایسے کام کیے ہیں جو اس کام (امامؑ کے قتل) کو آسان بنانے میں مفید ثابت ہو سکتے تھے۔ جیسے امامؑ کی طرف سے جھوٹی باتیں اور افواہیں پھیلانا۔ اسی طرح کی ایک بات یہ تھی جو دفعتاً "مرو" میں گردش کرنے لگی کہ "امام رضا علیہ السلام عوام کو اپنا غلام سمجھتے ہیں۔" یہ افواہ مامون کے جیرہ خواروں کی حکمت عملی کے بغیر نہیں پھیل سکتی تھی۔

جب اباالصلت یہ خبر امامؑ کے پاس لائے ہیں تو آپ نے فرمایا:

"بار الہا۔ اے آسمان و زمین کے پیدا کرنے والے تو گواہ ہے کہ نہ میں نے اور نہ میرے آبار و اجداد نے کبھی ایسی بات کہی ہے۔ یہ ان لوگوں (حکومت) کے ظلم و ستم ہیں جو ہم پر ہو رہے ہیں۔"

علمی مناظرہ کی مجلسیں اور ہر اس شخص سے مناظرہ جس سے امامؑ پر غلبہ پانے کی تھوڑی سی اُمید ہوا کرتی تھی، ان تدابیر ہی میں سے ہے۔ امام رضا علیہ السلام نے جب مختلف مذاہب و ادیان کے مناظرہ کرنے والوں کو شکست دی اور زیر کیا تو آپ کے علم و دانش کی شہرت ہر جگہ ہو گئی، مامون ہر متکلم اور مجادلہ کرنے والے کو امام رضاؑ سے مناظرہ کرنے کے لیے لے آتا، تاکہ کوئی تو امامؑ کو زیر کرنے

میں کامیاب ہو۔ لیکن جیسے جیسے مناظرے ہوتے گئے، امامؑ کی علمی قدرت آشکار ہوتی گئی اور مامون ناامید ہوتا گیا۔

روایات سے پتہ چلتا ہے کہ مامون نے ایک دو مرتبہ اپنے نوکروں اور جیرہ خواروں کے ذریعہ امامؑ کے قتل کی سازش کی اور ایک مرتبہ آپ کو "سرخس" میں قید بھی کیا۔ ان ہتھکنڈوں سے بھی کوئی نتیجہ نہیں نکلا، بلکہ الٹا اثر ہوا اور یہ نوکر اور قید خانے کے رکھوالے، سب امامؑ کی طرف کھنچ کر آگئے۔ اس امر سے مامون کی بیچارگی اور غصہ میں مزید اضافہ ہوا۔ آخرکار اس کے پاس اب کوئی چارہ نہ بچا بجز اس کے کہ وہ اپنے ہاتھ سے امامؑ کو زہر دے دے۔ اور اس نے کیا بھی یہی۔ ماہِ صفر ۲۰۳ھ ہجری، یعنی مدینہ سے خراسان آنے کے تقریباً دو سال بعد اور ولی عہد بنائے جانے کے ایک سال کچھ مہینے بعد مامون نے امامؑ کے خونِ ناحق سے اپنے ہاتھ آلودہ کر لیے اور ایسا ظلم کیا جو کبھی فراموش نہیں ہو سکتا۔



آیتِ شہادت

وکذالک جعلناکم امۃ وسطاً لتکونوا شھداء علی الناس ویکون الرسول علیکم شھیدا۔ (بقرہ/۱۴۳)

اور تحویلِ قبلہ کی طرح ہم نے تم کو درمیانی امت قرار دیا ہے، تاکہ تم لوگوں کے اعمال کے گواہ رہو اور پیغمبرؐ تمہارے اعمال کے گواہ رہیں۔

"کذالک": ایک قول یہ ہے کہ ماقبل آیات سے تحویلِ قبلہ کے بارے میں جو معنی ظاہر ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ "وکذالک" ... کا مفہوم یہ ہے کہ تحویلِ قبلہ کی طرح جس کا مقصد راہِ راست کی طرف ہدایت تھا، اسی طرح تمہیں امتِ وسطیٰ قرار دیا گیا ہے تاکہ شہادت کا مقصد حاصل ہو سکے۔ لیکن یہ بھی بعید نہیں ہے کہ 'وکذالک' میں 'واؤ' استیناف کے لیے ہو (اس صورت میں ماقبل آیت سے اس آیت کا کوئی تعلق نہیں رہ جاتا) اور 'کذالک' بھی ایسا کلمہ ہو جس سے 'تثبیتِ خبر' کا کام لیا جا رہا ہے۔ کلا کے برخلاف کہ جو خبر کی نفی کے لیے آتا ہے۔

خفاجی کتاب "شرح الشفا" میں کتاب "کشاف" کا قول نقل کرنے اور طولانی بحث کے بعد "کذالک" کے معنی میں اس طرح رقم طراز ہیں:

"میں نے اس مسئلہ میں بہت سے علماء و فضلاء سے گفتگو کی، لیکن دل نشیں اور قابلِ

اطمینان بات نہیں معلوم ہو سکی۔ اس کے بعد کتابوں کو کھنگال ڈالا۔ شرح القصائد میں "محمد بن زبیر" کی شرح میں دیکھا کہ جرجانی سے منقول ہے کہ "کذالک" ایسا لفظ ہے جو خبر کی تثبیت کے لیے آتا ہے، خواہ وہ خبر مقدم ہو یا مؤخر اور یہ لفظ کذالک "کلا" کی ضد ہے جو خبر کی نفی کرتا ہے۔[1]"

"**وسط**": وسط ایسی چیز کو کہتے ہیں جس کے "دو" یا کئی سرے ہوں۔ وسط "عدل" کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے کیونکہ وسط کسی بھی شئی کی معتدل ترین حالت ہے اور اطراف بعید ترین حالت ہے۔ دوسرے الفاظ میں عدل "افراط و تفریط" کے درمیان کی حالت ہے۔

"**شہادت**": شہادت و شہود، حضور، آنکھوں سے مشاہدہ کرنا یا بصیرت سے محسوس کرنے کے معنی میں آیا ہے، جب یہ کہا جاتا ہے کہ مجلس کا شاہد تھا تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ مجلس میں حاضر، موجود اور اس سے مطلع تھا۔ یہ لفظ نظارت (اشراف) اور اطلاع کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ خبرگیری اور نظارت کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ اس بنا پر لفظ "علی"، استعلاء (برتر ہونے) کے ساتھ استعمال ہوا ہے۔ اس لفظ کے دیگر موارد استعمال یہ ہیں کہ قرآن میں بارہا لفظ "شہید" خدا کے لیے آیا ہے۔ جیسے واللہ علیٰ کل شیئ شہید[2]

"**اُمّۃ وسطاً**": مذکورہ بالا آیت میں غور و فکر کرنے والے پر پوشیدہ نہیں ہے کہ امت کے لیے صفت وسط کا ہونا خدا کی جانب سے اس کے لیے احسان، تکریم اور تعظیم ہے۔ اس صفت کے عطا ہونے کا مقصد یہ ہے کہ یہ امت لوگوں پر شاہد ہے اور پیغمبر ان پر شاہد ہیں۔ ان امور میں کوئی شک نہیں۔ البتہ بحث اس بات میں ہے کہ امت کے وسط ہونے سے کیا مراد ہے؟ اور اس کا شہادت سے کیا ربط ہے؟

ایک قول یہ ہے کہ یہ امت افراط و تفریط سے دور راہ وسط پر گامزن ہے۔ اس قول کی بنا پر خدا کا یہ فرمان کہ اس نے اپنا دین، روح اور جسم کے تقاضیات میں برابری پیدا کرنے کے لیے بھیجا ہے، تاکہ کامل انسانی حقیقت سے اس کی تطبیق ہو جائے۔ جو امت ایسے دین کی پیرو ہو وہ مکمل نمونہ ہوتی ہے کہ ایک طرف تو محض مادہ پرست اور حیوانیت کی طرف مائل افراد کی شاہد ہے، دوسری طرف ایسے لوگوں کی شاہد جنہوں نے صرف انسان کے روحانی پہلوؤں سے استفادہ کیا ہے اور اعتدال سے خارج ہو گئے ہیں اور رہبانیت

---

[1] شرح الشفاء، ج ۱، ص ۴۳۰

[2] مجادلہ/۹

اختیار کرلی ہے۔ نتیجتاً یہ امت تمام افراد میں ایک اعلیٰ مثال ہے جس طرح کہ پیغمبر اکرمؐ امت میں نمونۂ کامل تھے۔ اسی معنی کو آیۂ کنتم خیر امۃ اخرجت للناس[1] (تم بہترین امت ہو جسے لوگوں کے لئے منظر عام پر لایا گیا ہے) بھی بیان کرتی ہے، لہٰذا یہ امت کامل ترین اور دیگر ملتوں کی مشکلیں حل کرنے والی ہے۔ اور ایک قول یہ ہے کہ اس آیت سے مراد اس امت کا مبلغ احکام اسلام اور عوام پر حجت ہونا ہے جو انسانوں کو راہِ کمال کی طرف ہدایت کرتی ہے جس طرح سے پیغمبرؐ اس امت پر حجت تھے۔ لہٰذا امت نے پیغمبرؐ سے دین اخذ کیا ہے اور عوام امت سے اخذ کریں گے۔ نتیجتاً یہ امت پیغمبرؐ اور عوام میں واسطہ اور وسیلہ ہوگی جس طرح سے پیغمبرؐ عوام اور خدا میں واسطہ اور وسیلہ ہیں۔

بعض علماء کا کہنا ہے کہ اس آیت کے مخاطب افراد (امتِ وسط) وجودی لحاظ سے وسط اور اعتدال میں واقع ہوئے ہیں، اس طرح سے کہ عوام کے اعمال و کردار پر ناظر و گواہ ہیں۔ نہ بصرف اعمال پر بلکہ ان کی نیات پر بھی اشراف اور نظر رکھتے ہیں۔ اس طرح اپنی ذمہ داری کو ادا کرتے ہیں تاکہ روز قیامت شہادت دے سکیں۔

ان سارے موارد سے قطع نظر، جو بیان کیے گئے ہیں یا بیان کیے جائیں گے، جو چیز قطعی ہے وہ یہ ہے کہ 'وسط' ہونے کی اہم صفت صرف خاص افراد کے لیے ہے۔ ہر اس فرد کے لیے نہیں ہے جو اسلام لایا اور اس نے چند مسائل کو سمجھ لیا۔ اس امت کو وسط اس وجہ سے کہا جاتا ہے کہ اس میں ایسے افراد پائے جاتے ہیں جو اس صفت کے حامل ہیں۔ یعنی محض بعض افراد کے صفتِ وسط سے متصف ہونے کی بنا پر ساری امت کو وسط کہا گیا جس طرح سے بنی اسرائیل کو مخاطب کیا گیا ہے:

وجعلکم ملوکا[2] اور تمہیں بادشاہ بنایا۔

جب کہ ایک وقت میں بادشاہ صرف ایک ہی ہوتا ہے۔

وانی فضلتکم علی العالمین[3] ہم نے تمہیں عالمین سے بہتر بنایا ہے۔

جبکہ برتری اور فضیلت بنی اسرائیل میں خاص گروہ کو عطا کی گئی تھی نہ کہ ساری قوم کو۔

محمد رسول اللہ والذین معہ اشداء علی الکفار رحماء بینھم[4] محمدؐ اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ کفار کے لیے سخت ترین اور آپس میں انتہائی رحم دل ہیں۔

---

[1] آل عمران/۱۱۰۔ [2] مائدہ/۲۰۔ [3] بقرہ/۴۷۔ [4] فتح/۲۹۔

حالانکہ رسولؐ اللہ کے ساتھ جتنے افراد تھے وہ سب کے سب مذکورہ بالا صفات کے حامل نہیں تھے بلکہ ایک محدود گروہ تھا جو ان صفات سے متصف تھا۔ لہٰذا آیت صرف اسی محدود گروہ کی خصوصیت بیان کر رہی ہے کیونکہ رسولؐ کے ساتھ جو مجمع رہتا تھا اس میں منافق اور فاسق بھی تھے۔

مورد بحث آیت اور اس سے مناسبت رکھنے والی آیتوں میں فکر و تدبر کرنے سے یہ قرآنی حقیقت آشکار ہو جاتی ہے جس پر قرآن نے متعدد مرتبہ تاکید بھی کی ہے۔ اور یہ حقیقت قیامت کے دن بندوں کے اعمال پر شہادت کی کیفیت اور شہیدوں کا مختلف طرح کا شہود ہے۔ قرآن میں اس سلسلہ میں بہت سی آیات میں جو بتاتی ہیں کہ قیامت کے دن اعضاء و جوارح، ملائکہ، اولیاء، انبیاء و صالحین شہادت دیں گے۔ ارشاد ہوتا ہے:

واشرقت الارض بنور ربها ووضع الكتاب وجيئ بالنبيين والشهداء وقضى بينهم بالحق[1]

اور زمین اپنے رب کے نور سے جگمگا اٹھے گی اور اعمال کی کتاب رکھ دی جائے گی اور انبیاء اور شہداء کو لایا جائے گا اور ان کے درمیان حق و انصاف کے ساتھ فیصلہ کیا جائے گا۔

ويوم نبعث في كل امة شهيدا عليهم من انفسهم وجئنا بك شهيدا على هؤلاء[2]

اور قیامت کے دن ہم ہر گروہ کے خلاف انہیں میں کا ایک گواہ اٹھائیں گے اور پیغمبرؐ آپ کو ان سب کا گواہ بنا کر لے آئیں گے۔

ان الله لا يظلم مثقال ذرة وان تك حسنة يضاعفها ويؤت من لدنه اجرا عظيما فكيف اذا جئنا من كل امة بشهيد وجئنا بك على هؤلاء شهيدا[3]

اللہ کسی پر ذرہ برابر ظلم نہیں کرتا۔ انسان کے پاس نیکی ہوتی ہے تو اسے دوگنا کر دیتا ہے اور اپنے پاس سے اجر عظیم عطا کرتا ہے۔ اس وقت کیا ہوگا جب ہم ہر امت کو اس کے گواہ کے ساتھ بلائیں گے اور پیغمبرؐ! آپ کو ان سب کا گواہ بنا کر لائیں گے۔

یہ تمام آیتیں واضح طور پر کیفیت شہادت کو بیان کرتی ہیں خصوصاً سورۂ نساء کی یہ دو آیتیں جن کا ذکر ہوا۔ یہ آیت سب سے پہلے جزا کے موقع پر خدا سے ظلم کی نفی کرتی ہے اور اس کے بعد ہر امت کا شاہد و گواہ

---

[1] زمر/۶۹۔ [2] نحل/۸۹۔ [3] نساء/۴۰-۴۱۔

لانے اور پھر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو گواہوں پر گواہ بنانے کا تذکرہ کرتی ہے۔ اور مذکورہ بالا آیت سے زیادہ واضح درج ذیل آیت کا مفہوم ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

ومن اظلم ممن افتریٰ علی اللہ کذباً اولٓئک یعرضون علیٰ ربھم ویقول الاشھاد ھٰؤلاءِ الذین کذبوا علیٰ ربھم[1]۔

اور اس سے بڑا ظالم کون ہے جو اللہ پر جھوٹا الزام لگاتا ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں جو خدا کے سامنے پیش کیے جائیں گے تو سارے گواہ گواہی دیں گے کہ ان لوگوں نے خدا کے بارے میں غلط بیانی سے کام لیا ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے:

ویوم القیامۃ یکون علیھم شھیداً[2]

اور قیامت کے دن عیسیٰ اس کے گواہ ہوں گے۔

ان آیات سے ظاہر ہوتا ہے کہ قیامت کے دن شہادت دی جائے گی، اور شہادت اس چیز پر دی جاتی ہے جس کے بارے میں گواہ کو پورا پورا علم ہو۔ قیامت میں شہادت کا تعلق صرف ظاہری عمل سے نہیں ہے، بلکہ نیت سے بھی ہے۔ لہٰذا جو ایسی شہادت دے گا وہ انسانوں کے ضمیروں اور نیتوں سے بھی واقف ہوگا۔ اس دنیا میں وہ انسانوں کے قلوب سے آگاہ ہوگا تاکہ قیامت میں حقیقی شہادت واقع ہو سکے۔ یہ معنی قرآن میں حضرت عیسیٰؑ کی حکایت میں واضح ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے:

وکنت علیھم شھیداً مادمت فیھم فلما توفیتنی کنت انت الرقیب علیھم وانت علیٰ کل شیٍٔ شھید[3]

میں جب تک ان کے درمیان رہا ان کا گواہ اور نگراں رہا، پھر جب تو نے مجھے اٹھا لیا تو، تو ان کا نگہبان ہے۔ اور تو ہر شے کا گواہ اور نگراں ہے۔

اس آیت میں حضرت عیسیٰؑ کی اپنی امت پر گواہی خدا کی گواہی کے ساتھ ذکر ہوئی ہے اور دو شہادتوں کی مشابہت بتائی گئی ہے، اس فرق کے ساتھ کہ حضرت عیسیٰؑ کی شہادت، خدا کی شہادت کا ایک پرتو ہے۔ حضرت عیسیٰؑ کی شہادت کی تشبیہ، خدا کی شہادت سے دینا صرف اسی وقت صحیح ہو پائے گا جب ہم

---

[1] ھود/۱۸۔ [2] نساء/۱۵۹۔ [3] مائدہ/۱۱۷۔

حضرت عیسیٰ کو مومنین کے قلوب و نیات سے آگاہ مانیں گے۔ ذیل کی آیت بھی اسی امر کی طرف اشارہ کر رہی ہے:

قل اعملوا فسیری اللہ عملکم و رسولہ والمومنون ؎

اور پیغمبر کہہ دیجیے کہ تم لوگ عمل کرتے رہو کہ تمہارے عمل کو اللہ، رسول اور صاحبان ایمان سب دیکھ رہے ہیں۔

بندوں کے اعمال پر مومنین اور پیغمبروں کی شہادت خدا کی شہادت کی ردیف میں ہے لہٰذا ان دونوں شہادتوں میں سنخیت پائی جاتی ہے۔ (جس طرح سے خدا بندوں کے ڈھکے چھپے اور آشکار اعمال کا شاہد اور ناظر ہے اسی طرح انبیاء و مومنین بھی بندوں کے عمل پر شاہد ہیں۔)

ان باتوں سے واضح ہوگیا کہ مذکورہ آیت (وکذالک جعلناکم) میں شہادت سے مراد بندوں کے اعمال کا شاہد ہونا ہے اور یہ شاہد حضرات کچھ خاص افراد ہیں جن کو 'وسط' بنایا گیا ہے خواہ وسط ہونے سے مراد پیغمبر اور عوام میں واسطہ ہونا ہو یا ایسے افراد ہوں جو افراط و تفریط سے بچے رہتے ہیں اور عوام کے لیے اعلیٰ نمونۂ عمل ہیں۔

درج ذیل آیت بھی قریب قریب ان ہی مضامین کی طرف اشارہ کرتی ہے:

ھو اجتباکم وما جعل علیکم فی الدین من حرج ملۃ ابیکم ابراھیم ھو سماکم المسلمین من قبل وفی ھذا لیکون الرسول شہیدا علیکم وتکونوا شہداء علی الناس ؎

اللہ نے تمہیں منتخب کیا ہے اور دین میں کوئی زحمت نہیں قرار دی ہے۔ یہی تمہارے بابا ابراہیم کا دین ہے۔ اس نے تمہارا نام پہلے بھی اور اس قرآن میں بھی مسلم اور اطاعت گزار رکھا ہے تاکہ رسول تمہارے اوپر گواہ رہیں اور تم لوگوں کے اعمال کے گواہ رہو۔

خلاصۂ کلام یہ کہ امت مسلمہ میں ایک واضح اور معین گروہ ہے جو بندوں کے اعمال پر شہید ہے یعنی شہادت کے عظیم رتبہ پر فائز ہے اور آیۂ شہادت پر آیۂ اجتباء کے انطباق کے مطابق یہ گروہ حضرت ابراہیم علیہ السلام

؎ توبہ/۱۰۵۔

؎ حج/۷۸۔

کی ذریت سے ہے۔ شہادت کا معنی جو مذکورہ بالا آیات سے حاصل کیا جا چکا ہے اس پر بعض روایات بھی دلالت کرتی ہیں۔ یہ روایتیں شیعہ اور سنی دونوں طریقوں سے مروی ہیں۔

روایاتِ اہلِ سُنّت:

بُخاری ابوسعید خدری سے نقل کرتے ہیں کہ پیغمبرؐ اسلام نے فرمایا:

"روز قیامت حضرت نوحؑ کو پکارا جائے گا، وہ لبیک کہہ کر حاضر ہوں گے۔ ان سے سوال کیا جائے گا کہ تم نے میری رسالت لوگوں تک پہنچائی؟ آپ کہیں گے "ہاں" پھر ان کی امت سے پوچھا جائے گا کیا تمہیں ہمارا پیغام دیا گیا تھا؟ امت کہے گی ہمارے پاس کوئی ڈرانے والا نہیں آیا تھا۔ پھر نوح علیہ السلام سے پوچھا جائے گا تمہارا شاہد و گواہ کون ہے۔ حضرت نوحؑ فرمائیں گے محمدؐ اور ان کی امت۔ پھر وہ گواہی دیں گے کہ حضرت نوحؑ نے رسالت خداوندی لوگوں تک پہنچائی تھی۔ "ویکون الرسول علیکم شہیدا" کے یہی معنی ہیں اور کذلک جعلناکم امۃ وسطا میں وسط سے مراد عدالت ہے[1]۔"

"کشاف میں روایت ہے کہ قیامت کے دن امتیں انبیاء کی تبلیغ رسالت کا انکار کریں گی تو خدا انبیاء سے دلیل اور بیّنہ (گواہ) طلب کرے گا۔ یہی روایت درّ المنثور، روح المعانی اور مجمع البیان میں بھی ہے۔

شیعہ روایات:

کلینیؒ، برید عجلی سے نقل کرتے ہیں کہ برید عجلی نے کہا کہ میں نے امام صادق علیہ السلام سے اس آیت "وکذالک جعلناکم امۃ وسطا" کے بارے میں سوال کیا تو امام علیہ السلام نے فرمایا:

"نحن الامۃ الوسطیٰ ونحن شہداء اللہ علی خلقہ وحججہ فی ارضہ۔

ہم ہی امت وسط ہیں، خدا کی طرف سے خلق پر ہم ہی شاہد (شہید) اور زمین پر اس کی حجت ہیں۔

میں نے پوچھا "ملۃ ابیکم ابراہیم" سے کیا مراد ہے؟ امامؑ نے فرمایا:

---

[1] بخاری، جلد ۶۔

"اس سے مراد خاص کر ہم ہی ہیں۔ (ھو سمّٰکم المسلمین من قبل وفی ھٰذا) اس نے تمہارا نام پہلے بھی اور اس قرآن میں بھی مسلمان اور اطاعت گزار رکھا ہے۔ اس سے مراد بھی ہم ہی ہیں، تاکہ رسول تم سب پر شاہد رہیں۔ خدا سے ہمیں جو چیزیں ملی ہیں اس پر رسول اللہ شاہد ہیں اور ہم عوام پر شاہد ہیں۔ پس جو ہماری تصدیق کرے گا ہم قیامت کے دن اس کی تصدیق کریں گے اور جو ہماری تکذیب کرے گا ہم قیامت کے دن اس کی تکذیب کریں گے[1]۔"

کتاب کافی میں ایک باب ہے جس کا عنوان ہے "ائمہ خدا کی طرف سے خلق پر شہید (شاہد) ہیں۔ اسی طرح کتاب بحار الانوار اور کتاب "اختصاص" شیخ مفید میں بھی ابواب ہیں۔

تفسیر عیاشی میں امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے:

"خدا نے فرمایا ہے "کذالک جعلناکم امۃ وسطا" اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ اس آیت میں خدا نے سارے موحدین کو مراد لیا ہے تو ایسا نہیں ہے۔ جس شخص کی شہادت خرمہ کی گٹھلی کی برابر بھی وقعت نہیں رکھتی کیا خدا قیامت کے دن ساری امتوں کے سامنے اس کی شہادت قبول کرے گا۔ خدا ایسا بالکل نہیں کرے گا۔ اور وہ امت جس پر حضرت ابراہیمؑ کی دعوت کو قبول کرنا واجب قرار دیا ہے۔ وہی لوگ "امتِ وسط" ہیں اور یہ لوگ بہترین امت ہیں جو لوگوں کے لیے نمونہ عمل ہیں[2]۔"

اس طرح کی حدیثیں آیتِ شہادت کی نسبت خود موضوع شہادت پر پوری طرح دلالت نہیں کرتیں اور اطاعت و عصیاں تمام اعمال کو شامل نہیں ہیں لیکن اس بات میں بھی کوئی شک نہیں ہے کہ ان میں شہادت سے مراد اعمال پر مبنی شہادت ہے اور وہ حدیثیں جو رسولِ اکرمؐ اور ائمہ علیہم السلام کے بندوں کے اعمال پر شہید ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔ اس آیت کی تفسیر کے ضمن میں بیان ہوئی ہیں۔

اسی طرح یہ آیت وقل اعملوا فسیری اللہ عملکم ورسولہ والمؤمنون (اور پیغمبرؐ کہہ دیجئے تم لوگ عمل کرتے رہو کہ تمہارے عمل کو اللہ، رسولؐ اور صاحبانِ ایمان دیکھ رہے ہیں۔) بندوں کے اعمال کے بارے میں انبیاء و اولیاء کے علم پر دلیل ہے۔ اسی طرح بحار الانوار میں بصائر نے یونس سے، انھوں نے

---

[1] اصولِ کافی، جلد ۱، ص ۱۹۰
[2] تفسیر عیاشی جلد ۱، ص ۶۳۔

امام رضا علیہ السلام سے روایت کی ہے۔ کہتے ہیں:

"جب پنجشنبہ کا ذکر ہوتا تھا، میں نے امامؑ سے سُنا، آپ نے فرمایا: یہ وہ دن ہے جس میں بندوں کے اعمال خدا، رسولؐ اور ائمہ علیہم السلام کی خدمت میں پیش کیے جاتے ہیں[1]۔"

بعض روایات میں روز دوشنبہ کا اضافہ ہے اور دوسری بعض روایات میں ہر صبح و شام اعمال پیش ہونے کا ذکر ملتا ہے۔

یہاں اس سلسلے میں آیات اور روایات میں جو اختلاف ہے اسکو واضح کر دینا بھی ضروری ہے۔ آیات ظاہراً شاہدوں (شہیدوں) کے بندوں کے اعمال پر بلکہ کچھ نفسی مقدمات پر بھی جو عمل کو عصیان یا طاعت کا رنگ دیتے ہیں بطور مستمر شاہد رہنے پر دلالت کرتی ہیں، جبکہ روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاہدین، عمل کے وجود میں آنے کے وقت شاہد اور ناظر نہیں ہیں۔ کیونکہ روایات میں "ان کی خدمت میں اعمال پیش کیے جانے" کی تعبیر استعمال ہوئی ہے۔ اگر شاہدین اعمال اور نفسی مقدمات پر شاہد اور ناظر ہیں تو ان کی خدمت میں اعمال کا پیش کیا جانا کیا معنی رکھتا ہے؟ یہ اختلاف و اشکال درجاتِ شہود (کے مراتب) پر غور و تامل کرنے سے برطرف ہو جاتا ہے۔ اس طرح کہ علم کے مختلف مرتبے اور درجات ہیں اور "اعمال کا پیش کیا جانا" ان مختلف مراتب کی مناسبت سے ہے۔ اس وضاحت سے خدا کی بارگاہ میں پنجشنبہ کے دن اعمال کے پیش کیے جانے کی تصحیح ہو جاتی ہے حالانکہ زمین و آسمان کا ذرہ ذرہ اس کے علم میں ہے۔

منصبِ شہادت کے مقتضیات:

امتِ شہید جو کہ امتِ وسط ہے اس کی عظمت و بزرگی ثابت ہو چکی اور آیاتِ شہادت نے اس کے لیے علم حضوری کو بھی ثابت کر دیا۔ اب اس مقام کے کچھ مقتضیات بیان کرتے ہیں:

الف۔ ان حضرات (امتِ وسط) کا غیب اور پوشیدہ امور کے بارے میں علم، عام لوگوں سے جداگانہ ہے۔ یہ بات واضح اور روشن ہے۔

ب۔ یہ امت وسطا لوگوں اور خدا کے درمیان الٰہی فیض کا ذریعہ ہیں یہ حضرات ولایت تکوینی کے

---

[1] بحار الانوار، جلد ۲۳، ص ۳۴۶۔

مقام پر فائز ہیں اور علم معنوی کے مالک ہیں اور تمام چیزوں کے علت و اسباب سے آگاہ ہیں بعض روایتیں اس معنی پر دلالت کرتی ہیں. 'کافی' میں امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے. آپ نے فرمایا:

"ان اللہ خلقنا. فاحسن خلقنا وصورنا فاحسن صورنا وجعلنا عینہ فی عبادہ ولسانہ الناطق فی خلقہ ویدہ المبسوطة علی عبادہ بالرافة والرحمة ووجہہ الذی یوتی منہ وبابہ الذی یدل علیہ وخزانہ فی سمائہ و ارضہ بنا اثمرت الاشجار واینعت الثمار وجرت الانہار وبنا ینزل غیث السماء وینبت عشب الارض وبعبادتنا عبد اللہ ولولا نحن ما عبد اللہ۔

خدا نے ہمیں خلق کیا اور بہت اچھا خلق کیا. اس نے ہمیں شکل عطا کی اور بہت اچھی شکل عطا کی. اپنے بندوں میں ہمیں اپنی آنکھ، زبان اور اپنی رحمت کا ہاتھ قرار دیا. ہمیں وہ چہرہ بنایا جہاں سے عطائیں ہوتی ہیں. اور ہمیں وہ باب بنایا جو اس کی طرف ہدایت کرتا ہے. ہمیں زمین و آسمان میں اپنا خزانہ دار بنایا. ہماری وجہ سے پیڑوں پر پھل آتے ہیں اور پھل پکتے ہیں اور نہریں جاری ہیں. ہماری وجہ سے بارش ہوتی ہے، سبزہ اگتا ہے. ہماری عبادت سے خدا کی بندگی ہوتی ہے. اگر ہم نہ ہوتے تو خدا کی عبادت نہ ہوتی[1]"

ج۔ گمراہی و ضلالت سے معصوم ہونا. آیت میں وسط کا مطلق بدون قید و شرط ذکر ہونا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ یہ حضرات افراط و تفریط و انحراف سے معصوم ہیں. اس کے علاوہ خدا کا ارشاد وجعلناکم امة وسطا جیسا کہ گزر چکا ہے اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ خدا نے لوگوں میں سے انہیں برگزیدہ کیا ہے. جیسا کہ خدا ایک اور جگہ فرماتا ہے ھو اجتبٰکم 'اس نے تمہیں برگزیدہ کیا ـــــ ہمیں قرآن میں بعض انبیاء کی بعثت پر صریحی بیان ملتا ہے. ظاہر سی بات ہے' ان لوگوں کو برگزیدہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ ہر اس چیز سے پاک و منزہ ہیں جو فطرت کو ناپاک

---

[1] اصول کافی جلد ۱ صفحہ ۱۴۳ ح ۵

اور آلودہ کرتی ہے۔ ان کے پاک ہونے کی وجہ سے ابلیس انہیں اغوا کرنے اور فریب دینے سے عاجز ہے قول ابلیس کی حکایت قرآن میں اس طرح ہے:

فبعزتک لاغوینھم اجمعین الا عبادک منھم المخلصین[1]

تیری عزت کی قسم: میں سب کو گمراہ کروں گا، علاوہ تیرے ان بندوں کے جنھیں تو نے خالص بنایا ہے۔

خدا حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میں فرماتا ہے:

کذالک لنصرف عنہ السوء والفحشاء انہ من عبادنا المخلصین[2]۔

یہ تو ہم نے اس طرح کا انتظام کیا کہ ان سے برائی اور بدکاری کا رخ موڑ دیں کہ وہ ہمارے مخلص بندوں میں سے تھے۔

خدا نے جس کو پاک و منزہ کیا ہو؛ برائیوں اور فحشاء سے دور رکھا ہو؛ اس کے بارے میں کیا تصور کیا جا سکتا ہے۔

د۔ یہ شہدا جب تک اسلام رہے گا تا قیامت یکے بعد دیگرے رہیں گے۔

کلینیؒ سماعہ سے نقل کرتے ہیں کہ امام صادق علیہ السلام نے اس آیۃ

فکیف اذا جئنا من کل امۃ بشھید وجئنا بک علی ھؤلاء شھیدا[3]

اس وقت کیا ہوگا جب ہم ہر امت کو اس کے گواہ کے ساتھ بلائیں گے اور پیغمبر آپ کو ان سب کا گواہ بنا کر لائیں گے۔

فرمایا کہ یہ آیت امت محمدؐ کے بارے میں خاص طور سے نازل ہوئی ہے۔ ان میں ہر زمانے میں ہم (اہل بیت) میں سے ایک امام رہے گا جو کہ ان پر شاہد ہوگا اور محمدؐ ہم پر شاھد ہوں گے[4]

(۔۔۔۔ جاری ہے)

---

[1] حجر/ ۳۹ ص/ ۸۳۔ [2] یوسف/ ۲۴۔ [3] نساء/ ۴۱۔ [4] اصول کافی جلد ۱ ص ۱۹۰ ح ۱

جامعۂ اہلِ بیتؑ میں داخلہ

خدا کا شکر ہے کہ جامعۂ اہلِ بیتؑ کے تعلیمی نظام کا پہلا مرحلہ کامیابی کے ساتھ پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا اور طلباء دوسرے مرحلہ میں داخل ہو چکے ہیں۔

جامعۂ اہلِ بیتؑ میں نیا داخلہ انشاء اللہ ۷ رجب ۱۴۱۸ھ میں عمل میں آئے گا جس کا طریقہ کار حسب ذیل ہے:۔

۱۔ جامعہ کے شرائط پر پورے اترنے والے طلباء داخلہ فارم حد اکثر ۵ ستمبر ۱۹۹۷ء تک جامعہ کے دفتر میں جمع کرا دیں۔

۲۔ داخلہ کے خواہشمند طلباء امتحان اور انٹرویو کے لیے ۶ اکتوبر کی صبح تک جامعۂ اہلِ بیتؑ پہنچ جائیں۔

۳۔ مذکورہ افراد کو ۶ اکتوبر سے ۱۶ اکتوبر تک جامعہ میں فارسی، عقائد، شرعی احکام اور تجوید قرآن کی تعلیم دی جائے گی اور ۱۷ اکتوبر کو ان ہی چیزوں کا امتحان لیا جائے گا۔

نوٹ:۔ مذکورہ مدت کے دوران قیام وطعام کے مصارف جامعہ برداشت کرے گا، البتہ آمد ورفت کا کرایہ خود طالب علم کے ذمہ ہوگا۔

۴۔ امتحان اور انٹرویو میں کامیاب ہونے والے طلباء انشاء اللہ ۷ رجب ۱۴۱۸ھ سے اپنی تعلیم کا باقاعدہ آغاز کریں گے۔

شرائطِ داخلہ:

۱۔ امیدوار حصول علم کا شوق اور تبلیغ دین کا جذبہ رکھتا ہو۔ ۲۔ کم از کم ہائی اسکول پاس ہو۔ ۳۔ پہلے کسی عربی مدرسہ میں داخلہ نہ لیا ہو۔ ۴۔ عمر تعلیمی سطح سے مناسبت رکھتی ہو۔ ۵۔ امتحان اور انٹرویو میں کامیابی حاصل کرے۔ ۶۔ اردو بول اور سمجھ سکتا ہو۔

مزید معلومات کے لیے درج ذیل پتہ پر رابطہ کریں:

جامعۂ اہلِ بیتؑ

اہلِ بیتؑ کلچرل کمپلیکس کالندی کنج روڈ، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵-۱۱۰۰۔ فون: ۶۹۴۵۲۹۸۔

امامِ زمانہؑ کی جائے سکونت

جناب ابراہیم امینی

فہیمی: زمانۂ غیبت میں امامِ زمانہؑ کہاں رہتے ہیں؟

ہوشیار: امامِ زمانہؑ کی کسی مخصوص جائے رہائش کا تعین نہیں ہے اور شاید ان کے رہنے کی کوئی مخصوص جگہ ہے بھی نہیں۔ وہ لوگوں کے درمیان رہتے اور آمد و رفت رکھتے ہیں۔ ممکن ہے اپنے رہنے کے لیے انھوں نے کسی دور دراز مقام کا انتخاب کیا ہو۔ احادیث بتاتی ہیں کہ وہ حج کے زمانے میں تشریف لاتے ہیں۔ اور اعمال حج میں شریک ہوتے ہیں۔ وہ لوگوں کو پہچانتے ہیں مگر لوگ ان کو نہیں پہچانتے ہیں[۱]

فہیمی: میں نے سنا ہے کہ شیعوں کا عقیدہ ہے کہ امامؑ کی غیبت شہر سامرہ کے اسی سرداب میں واقع ہوئی جو ان کے نام سے منسوب ہے اور جس کی زیارت کی جاتی ہے اور وہیں آپ زندگی گزارتے ہیں اور وہیں سے آپ کا ظہور ہوگا۔ اگر وہ اسی سرداب میں ہیں تو نظر کیوں نہیں آتے۔ ان کو کھانا پانی کون فراہم کرتا ہے اور وہ وہاں سے باہر تشریف کیوں نہیں لاتے۔ عرب شعرا میں سے کسی شاعر نے اس موضوع پر کچھ اشعار لکھے ہیں، جن کا مضمون یہ ہے کہ کیا ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ وہ سرداب سے باہر آئیں۔ تم اپنے خیال کے مطابق انھیں انسان کہتے ہو۔ تمہاری عقلوں پر خاک کہ عنقا اور خیالی دیو کے سوا ایک تیسرے وجود کا گمان رکھتے ہو۔

---

[۱] بحار الانوار، جلد ۵۲ ص ۱۵۲۔

ہوشیار: یہ جھوٹی باتیں محض دشمنی کی بنا پر ہیں شیعوں کا اس طرح کا کوئی عقیدہ نہیں ہے۔ کسی روایت میں یہ بیان نہیں ہوا کہ بارہویں امام سرداب میں رہتے ہیں اور وہیں سے ظہور فرمائیں گے۔ کسی شیعہ عالم نے اس طرح کی بات نہیں کہی۔ بلکہ معصومینؑ کی احادیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگوں کے درمیان رہتے اور آمد و رفت رکھتے ہیں۔ سدیر صیرفی نے امام جعفر صادقؑ سے روایت کی ہے کہ صاحب الامرؑ (امام زمان) اس اعتبار سے حضرت یوسفؑ سے مشابہ ہیں کہ حضرت یوسفؑ کے بھائی باوجودیکہ بہت عقلمند اور سمجھدار تھے اور پہلے حضرت یوسفؑ کے ساتھ رہ چکے تھے، جب ان کے پاس پہنچے تو اس وقت تک انھیں نہ پہچان سکے جب تک حضرت یوسفؑ نے خود اپنے کو نہ پہچنوایا۔ اور باوجود اس کے کہ حضرت یوسفؑ اور حضرت یعقوبؑ کے درمیان اٹھارہ دن سے زیادہ کی مسافت نہ تھی، حضرت یعقوبؑ کو ان کی کوئی اطلاع نہ تھی۔ پس یہ لوگ اس بات سے کیونکر انکار کریں کہ ایسا ہی عمل خداوند عالم نے صاحب الامرؑ کے معاملے میں نہ کیا ہوگا۔ آنجنابؑ بھی لوگوں کے درمیان آتے جاتے ہیں، ان کے بازاروں میں چلتے پھرتے ہیں اور ان کے فرش پر قدم رنجہ فرماتے ہیں لیکن لوگ انھیں پہچانتے نہیں اور اس وقت تک یہی صورت رہے گی تاآنکہ خدا انھیں اپنے آپ کو پہچنوانے کا حکم نہ دے۔[1]

اولادِ امامؑ کی مملکتوں کی داستان:

جلالی: میں نے سنا ہے کہ امام زمانؑ کی بہت سی اولاد ہے جو وسیع مملکتوں میں، جن کے پایہ تخت "ظاہرہ، رائقہ، صافیہ، طلوح اور عناطیس" ہیں، زندگی بسر کرتی ہے۔ اور آپ کی اولاد میں سے پانچ حضرات جن کے نام طاہر، قاسم، ابراہیم، عبد الرحمن اور ہاشم ہیں، ان ملکوں کے حکمران ہیں۔ ان ممالک کی صفات یہ ہیں کہ ان کی آب و ہوا جنت کا نمونہ ہے۔ وہاں مکمل امن ہے۔ بھیڑ یا و بکری ایک ساتھ رہتے ہیں۔ درندوں کو انسانوں سے کوئی مطلب نہیں۔ وہاں کے رہنے والے افراد صالح شیعہ اور مکتبِ امامؑ کے تربیت یافتہ ہیں۔ وہاں کسی قسم کا فتنہ و فساد نہیں ہے۔ خود امام زمانؑ کبھی کبھی ان ممالک کا معائنہ فرماتے ہیں۔ اور اسی طرح کی سینکڑوں مزیدار باتیں۔

---

[1] بحار الانوار، جلد ۵۲، ص ۱۵۴۔

ہوشیار: ان غیر معروف ممالک کی کہانیاں بالکل افسانوی باتیں ہیں۔ ان کی یکہ و تنہا سند وہ حکایت ہے جو کتاب 'حدائق الشیعہ'، 'انوار نعمانیہ' اور جنت الماوی میں نقل ہوئی ہے۔ وضاحت کے لیے ہم اس داستان کی سند کو بیان کرتے ہیں۔

یہ داستان اس طرح بیان ہوئی ہے کہ علی بن فتح اللہ کاشانی کہتے ہیں محمد بن علی بن حسین علوی نے اپنی کتاب میں سید بن احمد سے روایت کی ہے کہ حمزہ بن مسیب نے ۸ شعبان ۵۴۴ھ کو مجھ سے بیان کیا کہ عثمان بن عبدالباقی نے ۲ جمادی الثانی ۵۴۳ھ کو مجھ سے بیان کیا کہ احمد بن محمد بن یحیٰی انباری نے ۱۰ رمضان ۵۴۳ھ کو مجھ سے کہا:

"میں کچھ لوگوں کے ہمراہ عون الدین یحیٰی بن ہبیرہ وزیر کی خدمت میں حاضر تھا۔ اس محفل میں ایک محترم مگر انجان بزرگ بھی تشریف رکھتے تھے۔ جنھوں نے فرمایا۔ ایک سال میں کشتی کے ذریعہ سفر کر رہا تھا۔ اتفاقاً کشتی راہ سے بھٹک گئی اور ایک ایسے غیر معروف جزیرہ کی طرف لے گئی جس کے بارے میں ہم پہلے سے کچھ بھی نہ جانتے تھے۔ مجبوراً ہم نے کشتی سے اتر کر اس سرزمین پر قدم رکھا......"

اب احمد بن محمد ان ممالک کی دلچسپ داستان اس انجان شخص کے قول کے مطابق بیان کرتے ہیں اور پھر کہتے ہیں کہ:

"وزیر یہ داستان سننے کے بعد اپنے مخصوص کمرہ میں چلا گیا اور پھر ہم سب کو بلا کر کہا کہ جب تک میں زندہ ہوں، تم لوگ کسی سے یہ داستان بیان نہ کرنا۔ اور جب تک وزیر زندہ رہا، ہم نے کسی کو یہ واقعہ نہیں سنایا[۱]۔"

ہم نے اس کہانی کا حوالا اجمالی طور پر ذکر کر دیا تاکہ قارئین اس کے بے بنیاد ہونے کو محسوس کر سکیں اس کہانی سے مکمل واقفیت کے لیے مذکورہ کتابوں سے رجوع کیا جا سکتا ہے۔

عاقل حضرات سے یہ بات چھپی ہوئی نہیں ہے کہ اس طرح کی داستانوں سے ان ممالک کا وجود ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ اوّل تو یہ کہ اس اہم داستان کا بیان کرنے والا ایک نامعلوم شخص ہے جس کی بات کا اعتبار

---

[۱] الانوار النعمانیہ، مطبوعہ تبریز، جلد ۲ ص ۵۸۔

نہیں کیا جا سکتا۔ دوسرے یہ کہ یہ ناممکنات میں سے ہے کہ ایسے ممالک زمین پر موجود ہوں اور کسی کو اس کی خبر نہ ہو۔ بالخصوص آج کے زمانے میں جب کہ زمین کے چپے چپے کا نقشہ موجود ہے اور اہل علم حضرات اس سے باخبر ہیں۔ لیکن بعض لوگ ان داستانوں کا اس طرح دفاع کرتے ہیں جیسے اسلام کے مسلّم اصولوں کا دفاع کر رہے ہوں۔

وہ کہتے ہیں کہ شاید یہ ممالک آج موجود ہیں مگر خدا نے انھیں غیروں اور نامحرموں کی نظروں سے چھپا رکھا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس بات کے جواب کی ضرورت نہیں ہے۔ در حقیقت میں نہیں سمجھتا کہ اس طرح کے بے سند واقعہ کو اتنے کمزور اور ناقابل یقین شواہد کی بنیاد پر ثابت کرنے کی آخر ضرورت کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ ممکن ہے اب ان ممالک کا وجود نہ ہو لیکن گزشتہ زمانوں میں رہا ہو اور اب یہ برباد ہو گئے ہوں اور ان کے رہنے والے نابود ہو چکے ہوں۔ یہ امکان بھی بے بنیاد ہے۔ اگر اس طرح کی وسیع و عریض مملکتوں کا وجود ہوتا تو اکثر لوگوں کو ان کے احوال سے خواہ مختصر ہی سہی، واقفیت ہونی چاہیے تھی۔ اور تاریخ میں اس کا بیان ہونا چاہیے تھا۔ یہ بات بعید از امکان ہے کہ اتنی وسیع حکومتوں کا وجود ہوتا اور لوگ اس سے بے خبر ہوتے۔ اور صرف ایک غیر معروف اور انجان شخص کو ہی یہ سعادت نصیب ہوتی کہ وہ ان کے وجود سے باخبر ہوتا۔ اور بعد کو ان کے آثار صفحۂ ہستی سے اس طرح محو ہو جاتے کہ آثارِ قدیمہ کی کھدائیوں اور تاریخ کے صفحات پر ان مملکتوں اور ان کے باشندوں کا نام و نشان تک نہ ملتا۔

علامہ محقق آغائی شیخ آغا بزرگ تہرانی نے اس داستان کی صحت پر شک ظاہر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ داستان محمد بن علی علوی کی تالیف کردہ کتاب "تعازی" کے ایک نسخے کے آخر میں تحریر ہے جس کی بنا پر علی بن فتح اللہ کاشانی نے یہ سمجھا کہ مذکورہ داستان اس کتاب ہی کا حصّہ ہے۔ حالانکہ انھیں مغالطہ ہو گیا۔ اس داستان کا اس کتاب کا حصّہ ہونا ممکن نہیں ہے۔ کیونکہ یحییٰ بن ہبیرہ وزیر جس کے گھر اس واقعہ کا ہونا بتایا گیا ہے سنہ ۵۶۰ھ میں انتقال کر چکا تھا۔ اور کتاب "تعازی" کا مؤلف اس سے تقریباً دو سو سال پہلے گزرا ہے۔ مزید برآں اس داستان میں بھی تضادات موجود ہیں۔ کیونکہ احمد بن محمد بن یحییٰ انباری، جو اس داستان کے راوی ہیں، فرماتے ہیں کہ وزیر نے مجھ سے عہد لیا کہ میں کسی سے یہ داستان بیان نہ کروں اور میں نے اس عہد کو پورا کیا اور وزیر جب تک زندہ رہا، کسی پر اسے ظاہر نہیں کیا۔ اس بنا پر یہ داستان وزیر کے مرنے یعنی سنہ ۵۶۰ھ کے بعد بیان کی گئی، حالانکہ داستان کے متن میں عثمان بن عبدالباقی کہتے ہیں کہ احمد بن محمد بن یحییٰ انباری نے یہ داستان مجھ سے سنہ ۵۴۳ھ

میں بیان کی ہے۔[1]

مختصراً ہم اس بات پہ مجبور نہیں ہیں کہ امام زمانہؑ کی سکونت کے لیے غیر ضروری اور بے بنیاد دلائل کی بنا پر جزائر خضرا یا شہر 'جابلقا' و 'جابرصا' کا وجود ثابت کریں، یا یہ کہیں کہ امامؑ نے اپنی سکونت کے لیے آٹھویں اقلیم کا انتخاب کیا ہے۔

جلالی: امام زمانہؑ کی اولاد و عیال کا وجود ہے یا نہیں؟

ہوشیار: ہمارے پاس امامؑ کے رشتۂ ازدواج میں منسلک ہونے اور ان کی اولاد کے وجود، یا عدمِ وجود کا کوئی قطعی و حتمی ثبوت نہیں ہے۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ آپؑ نے نامعلوم طور پہ عقد کیا ہو اور اولاد بھی ہو جسے کوئی پہچانتا نہ ہو اور جو مناسب سمجھا ہو، اس پر عمل کیا ہو۔ حالانکہ بعض دعاؤں سے معلوم ہوتا ہے کہ امامؑ کی اولاد موجود ہے، یا بعد میں ہوگی۔[2]

ظہور کب ہوگا؟

ڈاکٹر: مہدی موعود کب ظہور فرمائیں گے؟

ہوشیار: ظہور کا کوئی وقت معین نہیں ہے، بلکہ ائمہ معصومینؑ نے ظہور کا وقت معین کرنے والوں کو جھوٹا بتایا ہے۔ مثال کے طور پر:

فضیل کہتے ہیں:

"میں نے امام باقرؑ کی خدمت میں عرض کی": کیا امام مہدیؑ کے ظہور کا وقت معین ہے؟

---

[1] الذریعہ، جلد ۵، ص۱۰۶۔

[2] مثلاً: اللھم اعطہ فی نفسہ واھلہ وولدہ وذریتہ وامتہ وجمیع رعیتہ ما تقر بہ عینہ۔ مفاتیح الجنان۔ نیز زیارت ناحیہ مقدسہ میں ارشاد ہے: اللھم اعطہ فی نفسہ وذریتہ وشیعتہ ورعیتہ وخاصتہ وعامتہ وعدوہ وجمیع اھل الدنیا ما تقر بہ عینہ۔ مفاتیح الجنان۔ لیکن علماء نظر رکھتے ہیں کہ یہ دعائیں جزء اخبار کے اس درجہ پر نہیں ہیں کہ ان سے استدلال کیا جائے اور اس طرح کے موضوعات کو ان سے ثابت کیا جائے۔ (بقیہ۔ صفحہ ۱۰۹)

حضرتؑ نے جواباً تین بار فرمایا: جو ظہور کا وقت معین کرتا ہے، وہ جھوٹ بولتا ہے۔[1]

عبدالرحمٰن بن کثیر کہتے ہیں:

"میں امام صادقؑ کی خدمت میں حاضر تھا کہ مہزم اسدی آئے اور عرض کیا کہ ظہور قائم آل محمدؑ اور حکومت حق کی تشکیل، جس کا انتظار ہے، کب واقع ہوگی؟ حضرتؑ نے جواب دیا: ظہور کے وقت کا تعین کرنے والے جھوٹے ہیں، جلدی کرنے والے ہلاک ہوں گے اور راضی برضا رہنے والے نجات پائیں گے اور ہماری طرف لوٹیں گے۔"[2]

محمد بن مسلم کہتے ہیں:

"امام صادقؑ نے مجھ سے فرمایا، جو تمہارے لیے ظہور کا وقت معین کرے اس کو جھٹلانے میں تامل نہ کرو، کیونکہ ہم ظہور کے وقت کا تعین نہیں کرتے۔"[3]

دس حدیثیں اور اسی مضمون کی ہیں۔

ان بہت سی احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نہ تو پیغمبر اکرمؐ نے اور نہ ہی کسی امامؑ نے ظہور کا وقت معین کیا ہے اور تمام غلط نتائج اخذ کرنے کے راستے بند کر دیے ہیں۔ چنانچہ اگر امامؑ سے کسی ایسی حدیث کی نسبت دی جائے جس میں ظہور کے وقت کی تعیین کی گئی ہو تو اگر اس کی کوئی تاویل و توجیہ کی جا سکتی ہے تو کی جائے، ورنہ خاموشی اختیار کی جائے، یا اسے جھٹلایا جائے۔ مثلاً ابولبید مخزومی کی یہ ضعیف الحمل حدیث جسے اس نے امامؑ سے نسبت دی ہے اور اس

(۔۔۔ بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ) لیکن بہرحال امامؑ کے اولاد ہونا بعید نہیں ہے۔ امام صادقؑ نے ایک حدیث میں فرمایا کانی اری نزول القائم فی مسجد السهلة باهله وعياله۔ بحار الانوار جلد ۵۲ ص ۳۱۷۔

[1] عن الفضيل قال سئلت ابا جعفر عليه السلام هل لهذا الامر وقت؟ قال كذب الوقاتون، كذب الوقاتون كذب الوقاتون۔ بحار الانوار جلد ۵۲ ص ۱۰۳۔

[2] بحار الانوار جلد ۵۲ ص ۱۰۳۔

[3] محمد بن مسلم عن ابی عبد الله عليه السلام قال: من وقت لك من الناس شيئاً فلا تهابن ان تكذبه فلسنا نوقت لاحد۔ بحار الانوار، جلد ۵۲ ص ۱۰۴ و ص ۱۱۷۔

کے ضمن میں کہا ہے کہ ہمارے قائم "الرّ" میں رہتے ہیں۔[1]

ظہور کی نشانیاں:

انجنیئر: ظہور کی نشانیاں کس حد تک صحیح ہیں؟

ہوشیار: کتب احادیث میں حضرت صاحب الامر عجّل اللہ تعالیٰ فرجہٗ کے ظہور کی بہت سی نشانیاں بتائی گئی ہیں۔ لیکن اگر ہم چاہیں کہ ہر ایک کے بارے میں الگ الگ گفتگو کریں تو بات لمبی ہو جائے گی اور وقت کے لحاظ سے اس کے لیے کئی نشستوں کا اہتمام کرنا پڑے گا مگر بعض باتیں مختصراً بیان کرنا ضروری ہیں۔

۱۔ بعض نشانیوں کی سند صرف خبرِ واحد ہے جسے غیر معروف اور غیر معتبر لوگوں نے بیان کیا اور ان پر یقین نہیں کیا جا سکتا۔

۲۔ اہلِ بیتؑ کی احادیث میں ظہور کی علامتیں دو طرح کی ہیں۔ ایک تو حتمی نشانیاں ہیں جو کسی شرط سے مشروط نہیں ہیں۔ اور ظہور سے قبل پائی جائیں گی۔ دوسری وہ علامتیں ہیں جو حتمی نہیں ہیں، بلکہ ایسے حوادث کے بیان پر مشتمل ہیں جو ظہور کی حتمی نشانیاں نہیں بلکہ کسی شرط سے مشروط ہیں کہ اگر اس شرط کا اطلاق صحیح ہو تو مشروط بھی ثابت ہو جائے گا، ورنہ معاملہ اس کے برعکس ہو گا اور مصلحت اس میں ہے کہ مختصراً ایسی نشانیوں کو ظہور کی نشانیوں میں شمار کیا جائے۔

۳۔ ظہور کی نشانیاں ایسی ہیں کہ جب تک وہ ظاہر نہ ہوں گی حضرت صاحب الامرؑ ظاہر نہ ہوں گے۔ اور ان میں سے ہر نشانی کا واقع ہونا اس امر کی دلیل ہے کہ ظہور حجت کا زمانہ کتنا قریب آگیا ہے لیکن اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ اس نشانی کے ظاہر ہونے کے فوراً بعد ہی حضرت صاحب الامرؑ ظہور فرمائیں، البتہ بعض نشانیوں کے بارے میں اس طرح کی صراحت موجود ہے کہ وہ ظہور کے وقت کے بالکل قریب ظاہر ہوں گی۔

۴۔ ظہور کی بعض علامتیں بطور معجزہ و خارق عادت واقع ہوں گی تا کہ مہدیٔ موعود کے دعوے کی صحت پر دلیل ہوں اور دنیا والوں کو غیر معمولی اور معجزانہ واقعات کی خبر دیں۔ یہ نشانیاں معجزات کی مانند ہیں اور صرف اس بنا پر انھیں غلط نہیں ٹھہرایا جا سکتا کہ یہ خلاف عادت ہیں۔

---

[1] بحار الانوار، جلد ۵۲ ص۱۰۱۔

۵۔ ظہور کی ان نشانیوں میں کتابوں میں ایک ایسی نشانی کا تذکرہ بھی ہے جس کا واقع ہونا، بظاہر محال اور خلافِ عقل ہے۔ مثلاً بیان کیا گیا ہے کہ امام مہدیؑ کے ظہور کے وقت سورج مغرب سے طلوع ہوگا اور سورج کو نیمۂ ماہِ رمضان میں اور چاند کو اسی مہینے کے آخر میں گہن لگے گا۔ اہلِ علم سے یہ بات پوشیدہ نہیں کہ اس طرح کے واقعات نظامِ عالم کے درہم برہم ہونے کی علامت ہیں جس میں نظامِ شمسی کی حرکات میں تبدیلی ہو جائے گی۔ لیکن یہ بات ذہن میں رہے کہ ان علامتوں کی سند خبرِ واحد سے زیادہ نہیں، جن پر یقین نہیں کیا جا سکتا۔ اور اگر کسی کو ان کی سند میں اندیشہ ہے تو وہ ان کو خلفائے بنی امیہ و بنی عباس اور ان کے کارندوں کی گڑھی ہوئی احادیث سمجھ سکتا ہے۔ کیونکہ اس دور میں لوگ امام مہدیؑ کے نام پر حکومتِ وقت کے خلاف بغاوت کرتے تھے اور اس ذریعے سے کچھ لوگوں کو اپنے ساتھ جمع کر لیتے تھے۔ خلفائے وقت جانتے تھے کہ امام مہدیؑ کے بارے میں اصل احادیث کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے وہ دوسرے بہانے تلاش کرتے تھے تاکہ لوگوں کے ذہن دوسری طرف متوجہ ہو جائیں اور علویوں کی تحریک ختم ہو کر رہ جائے۔ اس لیے انھوں نے ایسی محال نشانیاں گڑھیں کہ لوگ ان نشانیوں کے انتظار میں بیٹھے رہیں اور علویوں کی تحریک کو قبول نہ کریں۔ البتہ اگر یہ احادیث صحیح ہیں تو بطورِ اعجاز ان کے واقع ہونے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے تاکہ لوگوں کو ان غیر معمولی نشانیوں کے ذریعہ حالات کی خبر ہو اور دولتِ حق کی پیش رفت کے اسباب فراہم ہوں۔

داستانِ سفیانی:

انجینیر: سفیانی، جسے ظہور کی نشانیوں میں شمار کیا جاتا ہے، کون ہے اور اس کا کیا قصہ ہے؟

ہوشیار: بہت سی احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت صاحب الامرؑ کے ظہور سے پہلے ابوسفیان کی نسل سے ایک شخص خروج کرے گا۔ اس کی یہ صفت بیان کی گئی ہے کہ وہ بظاہر نیک ہوگا۔ اس کی زبان پر مسلسل ذکرِ خدا ہوگا، لیکن در اصل وہ انتہائی خبیث اور ناپاک آدمی ہوگا۔ پانچ علاقوں شام، حمص، فلسطین، اردن اور قنسرین پر اس کا قبضہ ہوگا۔ بنی عباس کی حکومت اس کے ہاتھوں ہمیشہ کے لیے تباہ و برباد ہو جائے گی۔ بہت سے شیعوں کو قتل کرے گا۔ اس کے بعد اس کو حضرت صاحب الامرؑ کے ظہور کی خبر ملے گی۔ وہ اپنے لشکر کو ان کے ساتھ جنگ کرنے کے لیے بھیجے گا لیکن لشکر ان تک پہنچ نہ

پلٹے گا اور مکہ و مدینہ کے درمیان ایک جنگل میں زمین میں دھنس جائے گا۔

جلالی: جیسا کہ آپ لوگ جانتے ہیں بنی عباس کی حکومت زمانہ ہوا ختم ہو چکی اور اس کا کوئی نشان تک باقی نہیں ہے جو سفیانی کے ہاتھوں تباہ ہو۔

ہوشیار: حضرت موسیٰ بن جعفرؑ نے ایک حدیث میں فرمایا ہے:

"بنی عباس کی حکومت کی بنیاد مکر و فریب پر ہے۔ یہ حکومت اس طرح ختم ہو جائے گی کہ اس کا کوئی نشان بھی باقی نہ رہے گا۔ لیکن یہ دوبارہ اس طرح وجود میں آئے گی جیسے اس کو کبھی کوئی نقصان ہی نہ پہنچا ہو[1]۔"

اس حدیث سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بنی عباس کی حکومت دوبارہ وجود میں آئے گی اور آخری بار سفیانی کے ہاتھوں برباد ہوگی۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اگرچہ سفیانی کا خروج حتمی سمجھا جاتا ہے مگر اس کے خروج کا زمانہ اور کیفیت حتمی طور پر معلوم نہیں ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ سفیانی کے ہاتھوں بنی عباس کی حکومت کی تباہی حتمی نہ ہو، بلکہ کسی اور ذریعہ سے یہ تباہی واقع ہو۔

فہیمی: میں نے سنا ہے کہ خالد بن یزید بن معاویہ بن ابی سفیان چونکہ خلافت کی تمنا رکھتا تھا جبکہ حکومت بنی مروان کے ہاتھوں میں تھی، چنانچہ اپنی تسکینِ قلب اور بنی امیہ کی ہمت افزائی کے لیے اس نے حدیثِ سفیانی گڑھی۔ صاحب اغانی نے خالد کے بارے میں لکھا ہے:

"پڑھا لکھا اور شاعر تھا۔ اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے جعلی حدیث سفیانی وضع کی[2]۔"

طبری لکھتے ہیں:

"علی بن عبداللہ بن خالد بن یزید بن معاویہ نے ۱۵۹ھ میں شام میں خروج کیا اور کہا میں وہی سفیانی ہوں جس کا انتظار کیا جا رہا ہے۔ اس طرح لوگوں کو اپنی طرف بلاتا تھا[3]۔"

ان تاریخی شہادتوں کی بنا پر حدیثِ سفیانی کے جعلی ہونے کو سمجھا جا سکتا ہے۔

ہوشیار: حدیثِ سفیانی خاص و عام سے روایت ہے اور عجب نہیں کہ متواتر ہو اور صرف ایک شک اور ایک باطل مدعی کے وجود کی بنا پر اس کو جعلی قرار نہیں دیا جا سکتا، بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ چونکہ یہ حدیث لوگوں میں علم

---

[1] بحار الانوار جلد ۵۲ ص ۲۵۱۔ [2] الاغانی جلد ۱۶ ص ۱۷۱۔ [3] تاریخ طبری جلد ۷ ص ۲۵۔

طور پر رائج تھی اور لوگ سفیانی کے انتظار میں تھے اس لیے بعض لوگوں نے اس سے غلط فائدہ اٹھایا اور خروج کرکے کہنے لگے ہم وہی سفیانی ہیں جس کا انتظار کیا جا رہا ہے اور اس طرح لوگوں کے ایک گروہ کو فریب میں مبتلا کیا۔

دجال کی داستان :

جلالی : دجال کے خروج کو ظہور کی نشانیوں میں شمار کیا جاتا ہے اور اس کی یہ صفت بیان کی گئی ہے کہ وہ ایک کافر شخص ہے جس کے ایک ہی آنکھ ہے وہ بھی پیشانی پر، اور وہ ستارے کی مانند چمکتی ہوگی۔ اس کی پیشانی پر لکھا ہوگا "یہ کافر ہے" جسے ہر پڑھا لکھا اور بے پڑھا لکھا پڑھ لے گا کھانے کا انبار اور پانی کی نہر اس کے ساتھ ہوگی، ایک سفید گدھے پر سوار ہوگا جس کا ایک قدم ایک میل کے برابر ہوگا۔ آسمان اس کے حکم سے پانی برسائے گا اور زمین سبزہ اگائے گی، زمین کے خزانے اس کے قبضہ میں ہوں گے، مُردوں کو زندہ کرے گا۔ جب وہ یہ صدا دے گا کہ میں تمہارا خدا ہوں جس نے تم کو پیدا کیا ہے اور جو تم کو رزق دیتا ہے۔ میری طرف آنے میں جلدی کرو۔ تو پوری دُنیا کے لوگ اس کی آواز سنیں گے۔

کہا جاتا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ کے زمانے میں موجود تھا اور اس کا نام عبداللہ یا صائد بن صید ہے پیغمبرؐ اور ان کے اصحاب اسے دیکھنے اس کے گھر گئے۔ خدائی کا دعویٰ کرتا تھا۔ عمر نے چاہا کہ اسے قتل کردیں مگر پیغمبرؐ نے منع کیا اب بھی زندہ ہے اور آخری زمانے میں شہر اصفہان کے گاؤں یہودیہ سے خروج کرے گا۔[1]

تمیم الداری سے، جو شروع میں یہودی تھا اور ۹ھ میں اسلام لایا، روایت کی گئی ہے۔ انھوں نے کہا کہ :

"میں نے دجال کو مغرب کے جزائر میں سے ایک جزیرہ پر اس طرح دیکھا کہ طوق و زنجیر میں جکڑا ہوا تھا۔"[2]

ہوشیار : دجال کو انگریزی زبان میں اینٹی کرائسٹ (AnTi ChrisT) یعنی ضد یا دشمن

۱۔ بحار الانوار جلد ۵۲ ص ۱۹۳ تا ۱۹۷ ۔ صحیح مسلم جلد ۱۸ ص ۴۶ تا ۵۸ ۔ سنن ابی داؤد جلد ۲ ص ۲۱۲ ۔

۲۔ صحیح مسلم جلد ۱۸ ص ۷۹ ۔ سنن ابی داؤد جلد ۲ ص ۲۱۳ ۔

مسیح کہتے ہیں۔ دجّال کسی معیّن شخص کا نام نہیں ہے، بلکہ عربی لغت میں ہر جھوٹے اور مکّار کو کہتے ہیں۔ انجیل میں بھی دجّال کا لفظ بہت نظر آتا ہے۔

رسالہ اوّل یوحنا میں لکھا ہے:

"جھوٹا اس کے علاوہ اور کون ہے جو حضرت عیسیٰ کے مسیح ہونے کا انکار کرے۔ وہ دجّال ہے جو باپ اور بیٹے کا منکر ہو۔[1]"

پھر اسی رسالہ میں یہ بھی تحریر ہے:

"تم نے سنا ہے کہ دجّال آئے گا۔ فی زمانہ بھی بہت سے دجّال ظاہر ہوئے ہیں۔[2]"

اسی رسالہ میں کہا ہے کہ ہر وہ روح جو حضرت عیسیٰ کی منکر ہے، خدا سے نہیں ہے، بلکہ وہ دجّال کی روح ہے جس کے بارے میں تم نے سنا ہے کہ آئے گا اور اب بھی دنیا میں ہے۔[3]

رسالہ دوم یوحنا میں تحریر ہے:

"بہت سے گمراہ کرنے والے دنیا میں ظاہر ہوئے ہیں جو حضرت عیسیٰ کے جسمانی طور پر ظاہر ہونے کے منکر ہیں، یہ گمراہ کرنے والے اور دجّال ہیں۔[4]"

انجیل کی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ دجّال کے معنی جھوٹے اور گمراہ کرنے والے کے ہیں۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دجّال کے خروج کرنے اور اس کے زندہ ہونے کی داستان اس زمانہ میں عیسائیوں میں مشہور تھی۔ اور وہ اس کے خروج کے منتظر تھے۔

ظاہر ہے حضرت عیسیٰ نے لوگوں کو خروج دجّال کی خبر دی اور اس کے فتنوں سے خبردار کیا۔ اس لیے نصاریٰ اس کے منتظر تھے اور قرین قیاس یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ کا دجّال موعود وہی جھوٹا مسیح اور دجّال تھا جو حضرت عیسیٰ مسیح سے تقریباً پانچ سو سال بعد ظاہر ہوا اور پیغمبری کا جھوٹا دعویٰ کیا اور اسی کو پھانسی پر لٹکایا گیا، نہ کہ مسیح پیغمبر کو۔[5]

---

[1] رسالہ یوحنا باب ۲ آیت ۲۲۔ [2] رسالہ اوّل باب ۲ آیۃ ۱۸۔ [3] رسالہ اوّل یوحنا، باب ۴ آیۃ ۳۔

[4] رسالہ دوم یوحنا، آیۃ ۷۔

[5] تعدد مسیح کے موضوع کے بارے میں المیزان جلد ۳ اور کتاب "تاریخ تقویم دا ایمان" سے رجوع کیا جائے۔

اسلام میں بھی وجودِ دجال کے بارے میں کتب احادیث میں حدیثیں موجود ہیں، پیغمبر اسلامؐ لوگوں کو دجال سے ڈرایا کرتے تھے اور لوگوں کو اس کے فتنوں کے بارے میں سناتے تھے، بلکہ فرماتے تھے کہ جتنے پیغمبر حضرت نوحؑ کے بعد مبعوث ہوئے سب نے اپنی قوم کو دجال سے ڈرایا[1] پیغمبرؐ نے فرمایا:

"قیامت اس وقت تک واقع نہ ہوگی جب تک کہ تیس دجال لوگ نہ ظاہر ہو جائیں، جو اپنے آپ کو پیغمبر سمجھتے ہوں گے[2]۔"

حضرت علیؑ نے فرمایا:

"ایسے دو دجالوں سے ہوشیار رہو جو اولادِ فاطمہؑ میں سے ہوں گے۔ ایک دجال بصرہ میں دجلہ سے بھی خروج کرے گا جو ہم میں سے نہیں ہے اور وہ تمام دجالوں کا پیش رَو ہوگا[3]۔"

پیغمبرؐ نے فرمایا:

"قیامت اس وقت تک برپا نہ ہوگی جب تک تیس جھوٹے اور دجال ظاہر نہ ہوں، جو خدا اور اس کے رسول پر جھوٹ بولیں گے[4]۔"

پیغمبرؐ نے فرمایا:

"دجال کے خروج سے پہلے ستر سے زیادہ دجال ظاہر ہوں گے[5]۔"

ان احادیث سے یہ پتہ چلتا ہے کہ دجال کسی معین شخص کا نام نہیں ہے اور اس کا اطلاق ہر گمراہ کرنے والے اور جھوٹے پر ہوتا ہے۔

خلاصہ: داستانِ دجال کی جڑیں کتابِ مقدس میں اور نصاریٰ کے درمیان ڈھونڈنی ہوں گی۔ اس کے بعد اس بارے میں اکثر احادیث اور ان کی تفصیلات کتب اہلِ سنت میں اپنے طور پر روایت ہوئیں۔ بہر حال، دجال کا اصل قصہ اجمالی طور پر بعید نہیں ہے کہ صحیح ہو لیکن اس کی پہچان اور صفات کے

---

[1] بحار الانوار جلد ۲، ص ۱۹۷۔

[2] عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہؐ "لا تقوم الساعۃ حتی یخرج ثلاثون دجالون کلھم یزعم انہ رسول اللہ۔" سنن ابی داؤد جلد ۲۔

[3] زہر اللاھم القش ص ۱۱۳۔ [4] سنن ابی داؤد جلد ۲۔ [5] کتاب مجمع الزوائد جلد ۲، ص ۳۳۳۔

بارے میں کوئی قابل اعتماد سند نہیں ہے[1] چنانچہ دجال کے قصّہ کو درست سمجھ لیا جائے تو بنا تردید اس میں افسانوی آمیزش سے اس کی اصلی حقیقت محو ہو گئی ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ آخری زمانہ میں، حضرت صاحب الامرؑ کے ظہور کے نزدیک ایک شخص پیدا ہو گا جو اپنے زمانے کے جھوٹوں اور مکّاروں کا سردار ہو گا اور جھوٹ میں اپنے سے پہلے تمام دجالوں پر سبقت رکھتا ہو گا۔ اپنے بے حقیقت دعووں سے بعض لوگوں کو گمراہ کرے گا۔ اس طرح ظاہر کرے گا جیسے زندگی اور آب و غذا اس کے ہاتھ میں ہے۔ لوگ اس حد تک غفلت میں ہوں گے کہ آسمان و زمین کو اس کے اختیار میں سمجھیں گے۔ وہ جھوٹ میں اتنا ماہر ہو گا کہ اچھے کاموں کو بُرا اور بُرے کاموں کو اچھا ثابت کر دے گا۔ جنت کو دوزخ اور دوزخ کو جنت ثابت کرے گا لیکن اس کا کفر پڑھے لکھے اور بے پڑھے لکھے پر ظاہر ہو گا۔

لیکن اس بات کا کوئی معتبر ثبوت نہیں ہے کہ صائد بن صید، دجالِ موعود، رسولِ خدا کے زمانے سے اب تک زندہ ہو۔ علاوہ بریں کہ حدیث ضعیف ہے، پیغمبرؐ نے دجال کے بارے میں فرمایا کہ وہ مکّہ اور مدینہ میں داخل نہ ہو سکے گا، جبکہ صائد بن صید دونوں شہروں میں داخل ہوا اور مدینہ میں اس کا انتقال ہوا اور لوگوں کا ایک گروہ اس کی موت کا گواہ تھا۔ بفرض اگر پیغمبرؐ نے صائد کو دجال کہا ہو تو دجال بمعنی جھوٹے کے ہے، نہ کہ دجالِ موعود، جو کہ ظہور کی نشانیوں میں ہے۔ مزید برآں پیغمبر اکرمؐ نے صائد سے ملاقات کی اور اپنے اصحاب سے اس کا تعارف دجال کی ایک فرد کے طور پر کرایا اور اس کے بعد آخری زمانہ میں دجال کے خروج کی خبر دی، تو یہ دونوں باتیں لوگوں میں گڈمڈ ہو گئیں اور انھوں نے یہ سمجھا کہ وہ دجال وہی ہے جو آخری زمانہ میں خروج کرے گا اور اس اعتبار سے انھوں نے اس کے زندہ رہنے اور طویل العمر ہونے کا نتیجہ نکال لیا۔

---

[1] ان صفات کے بارے میں اہم سند دو حدیثیں ہیں جو بحار الانوار اور دوسری کتابوں میں مذکور ہیں۔ ایک سند: محمد بن عمر بن عثمان بھذا الاسناد عن مشائخہ عن ابی یعلی الموصلی عن عبدالاعلی بن حماد عن ایوب عن نافع عن ابن عمر عن رسول اللہ۔ دوسری حدیث: الطالقانی عن الجلودی عن الحسین بن معاذ عن قیس بن حفص عن یونس بن ارقم عن ابی سیار الشیبانی عن الضحاک بن مزاحم عن نزال بن سبرہ عن علی۔۔۔ اہل علم جانتے ہیں کہ یہ دونوں اسناد قابل اعتبار نہیں ہیں کیونکہ طالقانی محمد بن عمر بن عثمان (۔۔۔ بقیہ صفحہ آئندہ)

فکری آمادگی:

ڈاکٹر: لوگوں کے درمیان مختلف آراء اور عقائد نیز تضاد اسباب و عوامل کے باوجود یہ کیونکر تصور کر لیا جائے کہ پوری دنیا میں ایک ہی حکومت قائم ہو جائے اور تمام روئے زمین کی زمام حکومت امام مہدیؑ کے ہاتھ میں ہو۔!

ہوشیار: اگر دنیا کے عمومی حالات اور علم و ادراک اور انسانی عقل کی یہی حالت رہے جو اب ہے، تو پوری دنیا پر ایک ہی حکومت قائم ہونا مشکل نظر آتا ہے۔ لیکن جس طرح انسان کی عقل، تمدن اور معلومات کی سطح گزشتہ زمانوں اور صدیوں میں اس درجہ تک نہیں پہنچی تھی اور زمانہ گزرنے کے ساتھ اور مختلف واقعات و انقلابات زمانہ کے نتیجہ میں اس حد تک پہنچی ہے۔ اسی طرح یہ اس درجہ پر بھی رُکے گی نہیں، بلکہ قطعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ انسانی علم میں روز بروز اضافہ ہوتا رہے گا اور آئندہ عقل، تمدن اور اجتماعی فلاح و بہبود کا تصور ترقی کرے گا۔ اپنی بات کو ثابت کرنے کے لیے ہم مجبور ہیں کہ گزشتہ زمانہ کے انسان کے احوال کا علم حاصل کریں تا کہ اس کے مستقبل کا فیصلہ کر سکیں۔

یہ بات خود اپنی جگہ پایۂ ثبوت کو پہنچی ہوئی ہے کہ خود غرضی کا جذبہ اور نفع کی تلاش انسانی طبیعت کا تقاضا ہے اور وہ طاقت جو انسان کو کارکردگی اور کوشش پر اکساتی رہتی ہے، اس کا مقصد بس یہی کسب کمال، خوش نصیبی اور فوائد کا حصول ہے۔ ہر شخص اپنی استطاعت کے مطابق یہ کوشش کرتا ہے کہ اپنے لیے فوائد حاصل کرے۔ اور اس سلسلہ کی رکاوٹوں کو دور کرے، لیکن دوسروں کے فائدہ کی طرف سے اپنی توجہ ہٹالے۔ لیکن انسان جب دوسروں کے فائدہ میں اپنا فائدہ بھی دیکھتا ہے تو پھر دوسروں کے فائدے بھی اسے منظور ہوتے ہیں اور وہ اس پر راضی ہو جاتا ہے کہ اپنے فائدہ کی کچھ مقدار دوسروں پر قربان کر دے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ.....) کے بارے میں لکھتا ہے کہ وہ مجہول الحال ہے اور نافع کے بارے میں لکھتا ہے کہ ابن عمر کا غلام ہے، گمراہ ہے اور گمراہ کرنے والا ہے۔ عمر کے بارے میں لکھا ہے کہ اس کے حالات معلوم نہیں۔ ضحاک بن مزاحم کے بارے میں لکھتا ہے کہ مجھے کوئی ایسی سند نہیں مل جو اسے نیک قرار دیتی ہو۔ نزال بن سبرہ کے بارے میں لکھا ہے کہ اس کے حالات معلوم نہیں ہیں۔

شاید پہلی بار انسان مطلق خود غرضی کی سطح سے نیچے اتر کر دوسروں کے فائدہ کی طرف اسی وقت متوجہ ہوا جب وہ رشتہ ازدواج میں منسلک ہوا۔ کیونکہ عورت اور مرد، دونوں میں یہ احساس بیدار ہوا کہ وہ ایک دوسرے کی ضرورت ہیں اور یہی احساس ضرورت تھا جس نے ان کے درمیان زن و شوہر کا رشتہ قائم کیا اور وہ اس رشتہ کے دوام و استحکام پر مجبور ہوئے۔ اپنی خود غرضی میں اعتدال پیدا کیا اور ایک دوسرے کے فائدہ کو مدّنظر رکھا۔ عورت مرد کے اجتماع سے خاندان کی بنیاد قائم ہوئی۔ در اصل خاندان کا ہر فرد خوشحالی حاصل کرنے اور اپنے کو بلندی تک پہنچانے کے علاوہ کوئی اور مقصد نہیں رکھتا لیکن چونکہ اسے احساس ہے کہ اس کی سعادت و خوش نصیبی خاندان کے دوسرے افراد کی سعادت و خوش نصیبی پر منحصر ہے، اس لیے وہ دوسروں کی خوش نصیبی بھی چاہتا ہے اور اس کے احساس تعاون کو تقویت حاصل ہوتی ہے۔ انسان نے مدتوں خانہ بدوشی کی زندگی گزاری۔ یہاں تک کہ اس کو مختلف حادثوں، تکالیف اور تباہیوں سے دوچار ہونا پڑا۔ مختلف خاندانوں کے ذہن نے ترقی کی اور انہیں احساس ہونے لگا کہ سعادت کو یقینی بنانے اور دشمنوں سے جنگ کرنے کے لیے اس سے بڑی اجتماعیت کی بنیاد ڈالیں۔ یہ ترقی فکر اور احساس ضرورت طائفہ اور قبیلے کے وجود میں آنے کے اسباب بنے۔ قبیلے کے افراد اس بات پر آمادہ ہوئے کہ پورے قبیلہ کے فائدہ کو پیش نظر رکھیں اور اپنے ذاتی اور خاندانی منافع کی ایک مقدار اجتماعی قبیلہ پر صرف کریں۔ یہی بلوغت فکر اور احساس ضرورت تھا جس نے ایک طویل مدت، بلکہ صدیوں تک انہیں آمادہ رکھا کہ ایک دوسرے کے پڑوس میں زندگی گزاریں اور اپنے رہنے کے لیے گاؤں یا شہر آباد کریں۔ اور اپنے شہر والوں کا فائدہ پیش نظر رکھیں اور ان کے حقوق کا دفاع کریں۔

انسان نے مدتوں اسی طرح زندگی گزاری، یہاں تک کہ پیش آنے والے واقعات و حادثات اور بعض گروہوں کے جھگڑوں اور طاقت والوں کے اثر و نفوذ کے باعث اس کی فکر نے چھوٹے اور محدود گاؤں اور شہر سے ترقی کی اور محسوس کیا کہ آرام و آسائش کی زندگی گزارنے کے لیے ضروری ہے کہ آس پاس کے دیہات اور شہروں کے باشندوں سے روابط قائم کیے جائیں تاکہ خطرات اور قومی دشمن کے حملوں کے وقت ایک دوسرے کی مدد حاصل کی جاسکے۔ اس طرح اور بڑا اجتماع قائم ہوا اور ان کی یہ وسیع جائے سکونت ملک و ملت کہلائی۔

مملکت میں رہنے والے انسان نے اس حد تک ترقی کی ہے کہ اپنے ملک کی محدود سرزمین کو

اپنے گھر کی طرح سمجھنے لگا۔ اور اس ملک کے رہنے والوں کو اپنے افرادِ خاندان سمجھا۔ اس ملک کے زمین کے تمام ذخائر اور عمومی اموال کو تمام مملکت کے لوگوں سے متعلق سمجھتا ہے۔ اپنے ملک کے ہر حصّہ کی ترقی سے خوش ہوتا ہے۔ نسل، زبان، شہر اور دیہاتوں کے اختلاف کو اہمیت نہیں دیتا اور سارے ملک کی خوشحالی میں ہی اپنی خوشحالی سمجھتا ہے۔ ظاہر ہے کہ کسی ملک کے افراد میں جتنا آپسی ربط ضبط اور فکری یگانگت ہوگی اور آپسی اختلافات کمتر ظاہر ہوں گے اتنا ہی وہ ملک ترقی کرے گا۔ آج کے دور کی ترقیات آسانی سے حاصل نہیں ہوئی ہیں، بلکہ سالوں اور صدیوں سے گزر کر اور ہزاروں مختلف تجربات و حادثات کا سامنا کرنے کے بعد ترقی کا یہ بلند درجہ حاصل ہوا ہے۔

انسانی فکر ہزاروں سال گزرنے اور زمانہ کے حوادث کا سامنا کرنے کے بعد ترقی کی بلندیوں پر پہنچی ہے۔ اور بڑی حد تک خود غرضی اور کوتاہ نظری سے دست بردار ہوئی ہے۔ مگر اب بھی اس قدر ترقی نہیں ہوئی ہے کہ اس پر ٹھہر جائے۔ علوم اور صنعتی ترقی کے باعث اب دنیا کے مختلف ممالک میں خاصا ربط ضبط ہوگیا ہے۔ پہلے جو مسافت مہینوں میں طے ہوتی تھی آج چند گھنٹوں اور منٹوں میں طے ہو جاتی ہے۔ دور دراز مقامات سے ایک دوسرے کی آواز سن لی جاتی ہے اور ایک دوسرے کو دیکھ لیتے ہیں۔ مختلف ممالک کے حالات و حوادث آپس میں مربوط ہوگئے ہیں اور ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اب انسان کو احساس ہو چلا ہے کہ وہ اپنے ملک کی سرحدوں کو بالکل بند نہیں کرسکتا اور باقی ممالک سے قطع تعلق کرکے الگ تھلگ ہوکر زندگی نہیں گزاری جاسکتی۔ دنیا کے انقلابات و حوادث نے اسے سمجھا دیا ہے کہ ایک ملک میں اتنی قوت و طاقت نہیں ہے کہ اپنے ملک کے افراد کی خوشحالی کو یقینی بنا سکے اور انھیں حوادث اور خطرات سے محفوظ رکھ سکے۔ اسی وجہ سے ہر ملک یہ کوشش کرتا ہے کہ اپنی اجتماعیت کو بڑا اور قوی بنائے۔

انسان کی یہ اندرونی خواہش کبھی جمہوریتوں کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے، کبھی مغربی و شرقی بلاک کی صورت اختیار کرتی ہے اور کبھی اسلامی ممالک کے اتحاد میں نمودار ہوتی ہے۔ کہیں یہ سرمایہ دار یا کمیونسٹ حکومتوں کی شکل میں نمایاں ہوتی ہے۔ اس طرح کی سیکڑوں مثالیں ہیں جو انسان کی توسیع طلبی اور وسعتِ فکر کی نشاندہی کرتی ہیں۔

آج انسان اس کوشش اور تلاش میں ہے کہ عمومی معاہدوں اور اتحاد کو توسیع دے اور اس طرح خطرات کو دور کرسکے نیز دنیا کے بحران اور مشکلات کو حل کرکے کرۂ زمین کے بسنے والوں کے لیے آرام و آسائش کے ذرائع فراہم کرسکے۔

بعض دانشوروں کے خیال کے مطابق موجودہ انسان کی جدوجہد، فعالیت اور توسیع طلبی ایک مکمل عمومی انقلاب اور تبدیلی کا پیش خیمہ ہے۔ انسانی دنیا بہت جلد سمجھ لے گی کہ اس طرح کے اتحاد بھی چونکہ محدود حیثیت رکھتے ہیں اس لیے

دنیا کے خوفناک اور خطرناک بحرانوں کو حل کرنے پر قادر نہیں ہیں، نہ صرف یہ کہ یہ بیماری کا علاج نہیں کر سکتے بلکہ ایک دوسرے کے خلاف صف آراء ہونے کے سبب مزید بحرانوں اور شدید مشکلات کے پیدا کرنے کا سبب بنیں گے۔

انسان اس وقت تجرباتی دور سے گزر رہا ہے تاکہ اس قسم کی یونین کے ذریعہ اپنی خود غرضی اور کوتاہ نظری کو حتی الامکان کم کرے نیز دنیاوی مشکلات و خطرات کو ختم کر دے۔ لیکن آخر کار وہ سمجھے گا کہ خود غرضی اور تنگ نظری کے ساتھ وہ انسانیت کی فلاح کا سامان نہیں کر سکتا۔ وہ چاہے یا نہ چاہے اسے ماننا ہوگا کہ کرۂ زمین کی حدود اور گھر کی حدود میں کوئی فرق نہیں ہے اور زمین پر رہنے والے سب ایک خاندان کی مانند ہیں۔ بالآخر اسے احساس ہوگا کہ اپنی اغراض دوسروں کی اغراض سے وابستہ ہیں۔ اس وقت انسانوں کے قلوب اور افکار سعدی شیرازی کی آواز میں آواز ملا کر ایمانداری سے اعتراف کریں گے۔

بنی آدم اعضای یک دیگر اند　　　　که در آفرینش ز یک گوہر اند

(تمام بنی آدم ایک دوسرے کے اعضاء کی مانند ہیں کیونکہ ان کی تخلیق میں ایک ہی جوہر کی کارفرمائی ہے۔)

وہ یہ بھی سمجھ لیگی کہ محدود اور ایک دوسرے سے مختلف نظام کے قوانین و احکام دنیا کی اصلاح کے لیے کافی نہیں ہیں۔ بین الاقوامی مجالس کے انعقاد اور انسانی حقوق کے لیے وضع قوانین کو اس بلند نظری، بیدار مغزی اور انسانی عقول کی تکمیل کی بنیاد اور پیش خیمہ سمجھنا چاہیے۔ حالانکہ طاقتور قوموں کے اثر و نفوذ کے باعث ابھی تک کوئی قابل ذکر کارنامہ انجام نہیں دیا گیا ہے اور کوئی خاص کامیابی حاصل نہیں ہوئی ہے تاہم اس طرح کے خیالات کا وجود خود ہی انسان کے درخشاں مستقبل کی پیش گوئی کرتا ہے۔

دنیا کے عام حالات و واقعات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مستقبل قریب میں انسان دو بہت نازک راستوں میں سے کسی ایک راہ پر کھڑا ہوگا۔ ایک محض مادہ پرستی سے عبارت ہے اور دوسری توحید خالص ہے۔ یعنی دنیائے انسانیت یا تو آنکھ بند کر کے مادہ پرستی کے راستہ پر چل پڑے اور احکام خداوندی کو بالکل نظر انداز کر دے، یا خدا کو مخلوق کا حاکم مانے اور الٰہی قوانین کے سامنے سر تسلیم خم کرے۔ دنیا کی مشکلات اور انسانی فلاح کے لیے آسمانی قوانین پر انحصار کرے۔ اور غیر خدا کے بنائے ہوئے قوانین کی پیروی نہ کرے۔ بہر طور یہ بات یقینی طور پر کہی جا سکتی ہے کہ ان کے اندر فطری طور پر خدا پرستی اور دین طلبی کا جو جذبہ موجود ہے وہ کبھی ختم نہ ہوگا۔ اور جیسا کہ آسمانی مذاہب، بالخصوص اسلام نے پیش گوئی کی ہے خدا کا لشکر آخر کار کامیاب اور غالب رہے گا اور دنیا کی سلطنت و حکومت نیک اور دیندار لوگوں کے ہاتھ میں آئے گی اور انسانوں کا یہ بڑا اجتماع انسانی فضائل، نیک اخلاق اور صحیح عقیدوں کی بنیاد پر استوار ہوگا۔ ہر قسم کے غلط تعصبات اور جھوٹے اور اختلاف پیدا کرنے والے معبود ختم ہو جائیں گے۔ تمام دنیا والے خدائے واحد اور اس کے احکام کے سامنے سر جھکا دیں گے۔ خدا پرست گروہ اور توحیدی لشکر

سرزمین ایمان کے وسیع و مضبوط قلعہ کی سرحدوں پر مقیم ہوگا اور دعوت پیغمبرؐ اسلام و قرآن مجید قبول کر لی جائے گی۔

ہاں قرآن مجید نے اہل کتاب کو پیشکش کی تھی کہ آؤ تا کہ ہم سب ایک کلمہ اور ایک مشترک لائحہ عمل کے تحت آجائیں اور عزم کر لیں کہ سوائے ایک خدا کے کسی کو معبود نہ مانیں گے۔ خدا کے سوا کسی کی پرستش نہ کریں گے اور افرادِ بشر کو واجب الاطاعت نہ جانیں گے۔[1]

قرآن کریم نیک، دیندار اور لائق مسلمانوں کے ذریعہ دنیوی انقلاب کے اس پروگرام کا اجرا چاہتا ہے جس کی پیغمبرؐ اسلام نے خبر دی ہے۔ وہ بلند اور غیر معمولی شخص جو انسان کے مختلف عقائد و نظریات کو یکسو کر کے ایک مقصد پر مرکز کرے گا، جو انسانی عقول کی تکمیل اور بیداری کا کام انجام دے گا۔ جو دشمنی اور اختلاف کے اسباب و عوامل کی بیخ کنی کرے گا اور صلح و صفائی قائم کرے گا۔ وہ وہی مہدی موعود ہے اور وہ پیغمبرؐ اسلام کی اولاد میں ہوگا۔ حضرت ابو جعفرؑ نے فرمایا:

"جب ہمارا قائم اٹھے گا تو اپنا ہاتھ لوگوں کے سروں پر رکھے گا اور ان کی عقلوں اور بکھرے ہوئے خیالات کو مجتمع و مرکز کر کے ایک مقصد کی طرف متوجہ کر دے گا اور ان کے اندر عمدہ اخلاق حد کمال تک پہنچا دے گا۔"[2]

علی ابن ابی طالبؑ نے فرمایا:

"جب ہمارا قائم برآمد ہوگا تو لوگوں کے دلوں سے دشمنی و عداوت ختم ہو جائے گی اور عام طور پر امن قائم ہو جائے گا۔"[3]

حضرت باقرؑ نے فرمایا:

"جب ہمارا قائم ظہور کرے گا تو تمام عمومی اموال، خزانے اور زمین کے ذخائر ان کے قبضہ و اختیار میں ہوں گے۔"[4]

(..... جاری ہے)

---

[1] آل عمران / ۶۴۔
[2] بحار الانوار، جلد ۵۲ صفحہ ۳۳۶۔
[3] بحار الانوار، جلد ۵۲ صفحہ ۳۱۶۔
[4] بحار الانوار، جلد ۵۲ صفحہ ۳۵۱۔

جناب احمد حامد مقدم

قرآن میں تصوّرِ جنگ

مختلف مکاتبِ فکر سے وابستہ عمرانیات اور سماجیات کے ماہرین نے جنگ کے گوناگوں پہلوؤں کا جائزہ لیا ہے اور اس بارے میں اپنے نظریات بیان کیے ہیں۔ البتہ جنگ پر ان حضرات کی توجہ دیگر سماجی مسائل کی بہ نسبت بہت کم ہے، تاریخ عمرانیات پر ذرا سا غور کرنے سے یہ امر واضح ہو جاتا ہے۔ اسی بنا پر کہا جاتا ہے کہ عمرانیات کی رو سے جنگ کے بارے میں ایسے نظریات نہیں ہیں جنہیں عمومی مقبولیت حاصل ہو۔ تاہم ماہرِ عمرانیات نے جنگ کے بارے میں جو تحقیقات کی ہیں اور اپنے نظریات کا اظہار کیا ہے وہ اس موضوع کے مختلف پہلوؤں پر حاوی ہے۔ جیسے جنگ کے اسباب، جنگ کے اجتماعی اور اقتصادی اثرات، جنگ میں شکست یا کامیابی کے اسباب وغیرہ۔ اس مقالہ میں بعض نظریات کے اختصار سے ذکر کے بعد جنگ کے سلسلہ میں قرآن کے نظریات پر بحث ہوگی۔

بعض محققین اور اربابِ نظر کا کہنا ہے کہ جنگ انسانی فطرت کا جزو ہے اور وہ انسان کی جنگجویانہ طبیعت کا سرچشمہ فطرت کو مانتے ہیں۔ محققین کے دوسرے گروہ کی رائے اس کے بالکل برعکس ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ جنگ آدمی کی سرشت میں ودیعت نہیں کی گئی ہے بلکہ اس کے اسباب سماجی ہیں۔ یہ سماجی زندگی ہے جو انسان کو جنگ پر اکساتی ہے۔ بعض افراد تاریخ بشریت کے کسی دور کو جنگ سے خالی نہ ہونے کی بنا پر "جنگ" کو انسانی زندگی کا ایک پائیدار اور لازمی عنصر مانتے ہیں۔ ان حضرات کا عقیدہ ہے کہ

جد وجہد (جنگ) اور کشمکش ناگزیر ہیں، اور یہی ان کے نظریات کی بنیاد بھی ہے۔ اس گروہ میں اشتاینمتز (STEINMETZ) اور گومپلو ویچ (GOMPLOWICZ)" ہیں۔[1]

ایک اور گروہ کا عقیدہ یہ ہے کہ "جنگ" انسانی زندگی کا لازمی عنصر نہیں ہے اور ایک دن ایسا آئے گا کہ اس کی زندگی میں جنگ کا نام ونشان بھی نہ ہوگا۔

ابن خلدون عظیم اسلامی مفکر، جنھوں نے سماجیات کی بحیثیت علم کے بنیاد رکھی، جنگ کے بارے میں تفصیلاً اپنے نظریات بیان کرتے ہیں اور انھوں نے اپنی اہم کتاب کے مقدمہ کی ایک پوری فصل اس کے لیے مخصوص کی ہے، کتاب اول کے باب سوم میں سینتیسویں فصل میں جنگوں کے بارے میں مختلف قوموں کی روش کے عنوان کے تحت بحث کی ہے۔ کتاب کی دوسری فصلوں میں بھی بحث کی مناسبت سے مطالب بیان کیے ہیں۔

ابن خلدون اس گروہ سے تعلق رکھتے ہیں جو جنگ کو انسانی فطرت کا جزو مانتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں جاننا چاہیے کہ انسان کی خلقت کے ابتدائی ایام سے ہی ان کے درمیان مختلف قسم کی کشمکش اور جنگیں چلی آرہی ہیں اور اس کی جڑ ایک دوسرے سے انتقام کا جذبہ اور کینہ توزی ہے۔ (ان ہی جذبات کے زیر اثر) ایک گروہ انتقام لینے کے لیے اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور دوسرا گروہ دفاع کے لیے آمادہ ہوجاتا ہے۔ اسطرح جنگ وجود میں آتی ہے اور یہ بشر کی فطری عادت ہے جس سے کوئی قوم اور قبیلہ محروم نظر نہیں آتا۔ انتقام جوئی کے کئی اسباب ہوسکتے ہیں جیسے غیرت ورشک، ایک دوسرے پر فخر ومباہات کرنا، ایک دوسرے پر تعدی کرنا یا خدا اور دین کی راہ میں غضب ناک ہونا یا تخت وتاج کی حفاظت اور اس کی بنیادوں کو استحکام بخشنا۔

ابن خلدون نے جنگ کی چار قسمیں بتائی ہیں۔ پڑوسی قبائل میں جنگ۔ غیر مہذب قوموں میں جنگ۔ جنگ کی یہ دو ظالمانہ اور فتنہ انگیز قسمیں ہیں۔

خدا کی راہ میں جنگ، جسے شریعت میں جہاد یا جنگ مقدس، کہا جاتا ہے اور اسلامی حکومت کی باغیوں

---

[1] ریمن کی آور جامعہ وحکومت ترجمہ ابراہیم علی کنی تہران بنگاہ ترجمہ ونشر کتاب ۱۳۴۹ ص ۲۳۳

کے نزدیک جنگ کی یہ دو قسمیں عادلانہ اور مقدس شمار ہوتی ہیں[1]۔ وہ گروہ جو جنگ کو فطرت انسانی کا جزو نہیں سمجھتا بلکہ سماجی اور اقتصادی حالات کو اس کا سبب جانتا ہے، اس میں کیمونسٹ بھی ہے۔ یہ مکاتبِ فکر دیگر سماجی مسائل کی طرح جنگ کو بھی طبقاتی اور تضادِ طبقاتی نظریہ کی روشنی میں دیکھتے ہیں۔ ان کے تجربہ و تحلیل کا نمونہ یہ ہے: "جنگ کی اصلی علت کا سراغ طبقاتی اختلاف میں لگانا چاہیے۔ ایک ملک کے طاقتور لوگ عموماً دوسرے ملک کو تاراج کرنے کے لیے جنگ کرتے ہیں اور اپنی جنگ میں لوگوں کو شریک کرنے کے لیے مختلف بہانوں سے دعوت دیتے ہیں۔ کبھی کہتے ہیں ہماری جنگ ہمارے ذاتی مفاد کے لیے نہیں ہے بلکہ وطن کی خدمت کے لیے ہے۔ اور کبھی وہ انسانیت کی خدمت کا بھی دعویٰ کرتے ہیں۔ حاکم طبقہ ان حیلوں سے اپنی خود پسندی اور مفاد کو شرافت کے لبادہ میں چھپا لیتا ہے اور سادہ دل عوام کو کشت و خون پر آمادہ کر لیتا ہے[2]۔

عقلی اور تاریخی شواہد کے اعتبار سے جنگ کے سلسلہ میں کیمونزم کے نظریہ کا بے سروپا ہونا ہویدا ہے۔ بعض ماہرینِ سماجیات جنگ کے اسباب کو آبادی کی کثرت اور اس کثیر آبادی کے مختلف قسم کے دباؤ میں ڈھونڈتے ہیں۔ اگرچہ اس نظریہ کو بعض صاحبانِ نظر معتبر جانتے ہیں لیکن تجربہ سے یہ بات ثابت نہیں ہے۔ اسی سلسلہ میں ایک نظریہ ہے: "جنگ بھی آندھی، طوفان کی طرح آبادی کے مختلف دباؤ کی بنا پر وجود میں آتی ہے نہ کہ کثرتِ آبادی کی بنا پر۔ ۱۹۱۴ء اور ۱۹۴۰ء کی جنگیں جرمنی کی آبادی کے رشد کے مقابلہ فرانس کی آبادی کے انحطاط کا نتیجہ تھیں۔ فقیر اور نادار کثیر آبادی میں جنگ کے امکانات متعادل اور متوسط آبادی کی بہ نسبت بہت کم ہیں کیونکہ متعادل آبادی میں جنگ کی ضروریات مثلاً غذائی مواد نیز جنگی اسلحہ کے ذخائر فراہم کرنے کی زیادہ صلاحیت ہوتی ہے[3]۔

جنگ کے سماجی، اقتصادی، سیاسی اور ثقافتی اثرات کے بارے میں بھی مختلف نظریات کا اظہار ہوا ہے۔ بعض کو جنگ سے حاصل ہونے والے نتائج کی افادیت پر اصرار ہے اور بعض اس کے نقصانات کے قائل ہیں۔ بعض لوگ جنگ کو عوام میں بیداری کا عامل اور سماجی کمال و ارتقاء میں تیزی لانے اور معاشرہ

---

[1] عبدالرحمٰن بن خلدون، مقدمہ جلد اول ص ۳۱۸ و ص ۳۱۹

[2] ا۔ ح۔ آریانپور۔ زمینہ جامعہ شناسی تہران ص ۳۸۸

[3] آلفرد سووی: مالتوس و دو مارکس ترجمہ ابراہیم صدقیانی ص ۳۲-۳۳

کے اتحاد کا سبب مانتے ہیں۔ ان میں اگست کانت (A. COMTE) اور ہربت اسپنسر H. SPENCER جیسے سماجیات کے مغربی ماہرین قابلِ ذکر ہیں۔

اسلام جنگ کے بارے میں خاص نظریات رکھتا ہے۔ ہمارا مقصد اس مقالہ میں ان نظریات کا تفصیلی جائزہ لینا ہے۔ اس سے پہلے جنگ کے سلسلے میں اسلام کے نظریہ کو بطور کلی پیش کریں گے۔ اس سلسلے میں علامہ طباطبائی اپنی گراں قدر تفسیر المیزان میں فرماتے ہیں۔

مسئلہ جنگ وجدال اور اخلاقیات جو خسارت بار جنگوں کا سبب ہوتے ہیں، بشری زندگی میں ایک ناگزیر امر ہے جو خواہ مخواہ پیش آہی جاتا ہے۔ اگر یہ امر ناگزیر نہ ہوتا تو انسان کے وجود میں وہ قوتیں جو دفاع کے وقت کام میں لائی جاتی ہیں مثلاً غضب شدت اور فکری توانائی وہ ودیعت نہ کی جاتیں۔ یہ قوتیں خود اس بات پر دلیل ہیں کہ جنگ کا واقع ہونا ناگزیر چیز ہے اور اس سے فرار ممکن نہیں ہے۔ لہٰذا اس رو سے فطرت کے حکم کے مطابق اسلامی معاشرہ پر واجب ہے کہ وہ ہمیشہ اور ہر حال میں، جن جدید اسلحوں سے دشمن لیس ہے خود بھی لیس ہو جائے۔[۱]

قرآن اور حدیث میں جنگ کے لیے 'جہاد' اور 'قتال' کی تعبیریں استعمال ہوئی ہیں۔ اس اہم فریضہ پر اسلام نے بہت زیادہ توجہ کی ہے اور اسے واجبات دین میں شمار کیا ہے۔ اسی وجہ سے اسلام کے تمام فرقوں نے جہاد کے موضوع پر سیر حاصل بحثیں کی ہیں۔ قرآن اور فریقین کی کتابوں میں مختلف مقامات پر مختلف لحاظ سے جہاد اور اس کے مسائل مثلاً جہاد کی اہمیت، جہاد کے شرائط، صلح کے شرائط وغیرہ پر بحث ہوئی ہے۔ اس مقالہ میں بطور مختصر "جنگ قرآن کی نظر میں" پر بحث ہوگی اور اس سلسلہ میں مختلف آیات کا جائزہ لیا جائے گا۔ ان آیات کی دستہ بندی حسب ذیل طریقہ پر کی گئی ہے۔

۱-۱ وہ آیات جن میں پیغمبر اسلام اور مسلمانوں کو جہاد کا حکم دیا گیا ہے اور جہاد کو واجب قرار دیا گیا ہے۔

كتب عليكم القتال وهو كره لكم وعسىٰ ان تكرهوا شيئاً وهو خير لكم وعسىٰ ان تحبوا شيئاً وهو شر لكم والله يعلم وانتم لا تعلمون۔[۲]

تمہارے اوپر جہاد فرض کیا گیا ہے اور وہ تمہیں ناگوار ہے اور یہ ممکن ہے کہ جسے تم برا سمجھے

---

[۱] المیزان ج ۲، ۱۰۷ ترجمہ سید محمد باقر موسوی ہمدانی ۱۴۰۸ھ
[۲] بقرہ/ ۲۱۶

ہو وہ تمہارے حق میں بہتر ہو اور جسے تم دوست رکھتے ہو وہ بُرا ہو خدا جانتا ہے اور تم نہیں جانتے ہو۔

یاایہاالنبی حرض المؤمنین علی القتال[1]

اے پیغمبر آپ لوگوں کو جہاد پر آمادہ کریں۔

وقاتلوھم حتیٰ لاتکون فتنة ویکون الدین للّٰہ[2]

اور ان سے اس وقت تک جنگ جاری رکھو جب تک سارا فتنہ ختم نہ ہو جائے اور دین صرف اللہ کا رہ جائے۔

۲-۱- وہ آیات جو اسلامی جہاد کے حقیقی ہدف کی نشان دہی کرتی ہیں جو "سبیل اللہ" ہے، لہٰذا مسلمانوں پر واجب ہے کہ اس ہدف کو پانے کے لیے اور اس کی راہ سے رکاوٹوں کو ہٹانے کے لیے جہاد میں مشغول ہو جائیں۔

وقاتلوا فی سبیل اللّٰہ واعلموا ان اللّٰہ سمیع علیم[3]

اور راہِ خدا میں جہاد کرو اور یاد رکھو کہ خدا سننے والا بھی ہے اور جاننے والا بھی۔

الذین آمنوا یقاتلون فی سبیل اللّٰہ والذین کفروا یقاتلون فی سبیل الطاغوت[4]

ایمان والے ہمیشہ خدا کی راہ میں جہاد کرتے ہیں اور جو کافر ہیں وہ ہمیشہ طاغوت کی راہ میں لڑتے ہیں۔

فقاتل فی سبیل اللّٰہ لا تکلف الا نفسک وحرض المؤمنین[5]

اور آپ خدا کی راہ میں جہاد کریں اور آپ اپنے نفس کے علاوہ دوسروں کے مکلف نہیں ہیں اور مومنین کو جہاد پر آمادہ کریں۔

فلیقاتل فی سبیل اللّٰہ الذین یشرون الحیٰوة الدنیا بالآخرة[6]

---

[1] انفال/۶۵ [2] نساء/۸۴ و انفال/۳۹ [3] بقرہ/۱۹۳ [4] بقرہ/۲۴۴ [5] نساء/۷۶ [6] نساء/۸۴ [7] نساء/۷۴

اب ضرورت ہے کہ راہِ خدا میں وہ لوگ جہاد کریں جو زندگانی دنیا کو آخرت کے عوض بیچ ڈالتے ہیں۔

۳۔۱۔ وہ آیات جو اسلام کے دشمنوں کی اہم خصوصیتیں اور صفات بیان کرتی ہیں: ان آیات کی بنا پر مسلمانوں کا فریضہ ہے کہ وہ مندرجہ ذیل صفات کے حامل گروہوں سے جنگ (جہاد) کریں۔

۱۔۳۔۱۔ محارب اور مفسد گروہ:

انما جزآء الذین یحاربون اللہ و رسولہ و یسعون فی الارض فساداً ان یقتلوا او تصلبوا او تقطع ایدیھم وارجلھم من خلاف او ینفوا من الارض ذالک لھم خزی فی الدنیا ولھم فی الآخرۃ عذاب عظیم [1]

بس خدا اور رسول سے جنگ کرنے والے اور زمین میں فساد کرنے والوں کی سزا یہی ہے کہ انھیں قتل کر دیا جائے یا سولی پر چڑھا دیا جائے یا ان کے ہاتھ اور پیر مختلف سمت سے قطع کر دیے جائیں یا انھیں ارضِ وطن سے نکال باہر کیا جائے یہ ان کے لیے دنیا میں رسوائی ہے اور ان کے لیے آخرت میں عذاب عظیم ہے۔

۲۔۳۔۱۔ ایسے گروہ جو بے ایمان ہیں اور محرمات کے پابند نہیں ہیں:

قاتلوا الذین لا یؤمنون باللہ ولا بالیوم الآخر ولا یحرمون ما حرم اللہ و رسولہ ولا یدینون دین الحق من الذین اوتوا الکتاب حتی یعطوا الجزیۃ عن ید وھم صاغرون [2]

ان لوگوں سے جہاد کرو جو خدا اور روزِ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اور جس چیز کو خدا اور رسول نے حرام قرار دیا ہے اُسے حرام نہیں سمجھتے اور اہلِ کتاب ہوتے ہوئے بھی دینِ حق کا التزام نہیں کرتے۔ یہاں تک کہ اپنے ہاتھوں سے ذلت کے ساتھ تمہارے سامنے جزیہ پیش کرنے

[1] مائدہ/۳۳ [2] توبہ/۲۹

پر آمادہ نہ ہو جائیں۔

۱-۲-۳۔شیطان کے ہمنوا اور دوست:

فقاتلوا اولیاء الشیطٰن ان کید الشیطان کان ضعیفاً۔[۱]

تم شیطان کے ساتھیوں سے جہاد کرو بیشک شیطان کا مکر بہت کمزور ہے۔

۱-۳-۴۔مادہ پرست افراد:

فلیقاتل فی سبیل اللہ یشرون الحیٰوۃ الدنیا بالآخرۃ ومن یقاتل فی سبیل اللہ فیقتل او یغلب فسوف نؤتیہ اجراً عظیماً۔[۲]

اب ضرورت ہے کہ راہِ خدا میں وہ لوگ جہاد کریں جو زندگانی دنیا کو آخرت کے عوض بیچ ڈالتے ہیں اور جو بھی راہِ خدا میں جہاد کرے گا وہ قتل ہوجائے یا غالب آجائے دونوں صورتوں میں ہم اسے اجرِ عظیم عطا کریں گے۔

۱-۳-۵۔ کافرین، مشرکین اور منافقین:

فلا تطع الکافرین وجاھدھم بہ جہاداً کبیراً۔[۳]

آپ کافروں کے کہنے میں نہ آئیں اور اُن سے آخر دم تک جہاد کرتے رہیں۔

یاایھا النبی جاھد الکفار والمنافقین واغلظ علیھم وماواھم جھنم وبئس المصیر۔[۴]

پیغمبر! کفار و منافقین سے جہاد کیجیے کہ ان کا انجام جہنم ہے جو بدترین ٹھکانہ ہے۔

سورۂ توبہ میں کفار سے صلح کرنے کی شرائط بیان کرنے کے بعد، وہ کفار جو ان شرائط کے مخالف ہیں اور اسلام سے جنگ کرنا چاہتے ہیں، خدا نے ان سے جہاد اور لڑائی کرنے کا حکم دیا ہے۔

قاتلوا المشرکین کافۃ کما یقاتلونکم کافۃ۔[۵]

اور تمام مشرکین سے اسی طرح جہاد کرنا جس طرح وہ تم سے جنگ کرتے ہیں۔

---

[۱] نساء/۷۶، [۲] نساء/۷۴، [۳] فرقان/۵۲

[۴] توبہ/۷۳، تحریم/۹ [۵] توبہ/۳۶

یا ایھا الذین آمنوا قاتلوا الذین یلونکم من الکفار ولیجدوا فیکم غلظۃ واعلموا ان اللہ مع المتقین۔[1]

ایمان والو آس پاس والے کفار سے جہاد کرو اور وہ تم میں سختی اور طاقت کا احساس کریں۔ اور یاد رکھو کہ اللہ صرف پرہیزگار افراد کے ساتھ ہے۔

فاذا انسلخ الاشھر الحرم فاقتلوا المشرکین حیث وجدتموھم وخذوھم واحصروھم واقعدوا لھم کل مرصد فان تابوا واقاموا الصلوٰۃ و آتوا الزکوٰۃ فخلوا سبیلھم ان اللہ غفور رحیم۔[2]

پھر جب یہ محترم مہینے گزر جائیں تو کفار کو جہاں پاؤ قتل کر دو اور گرفت میں لے لو اور قید کر دو اور ہر راستہ اور گزرگاہ پر ان کے لیے بیٹھ جاؤ اور راستہ تنگ کر دو پھر اگر وہ توبہ کرلیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں تو ان کا راستہ چھوڑ دو کہ خدا بڑا بخشنے والا اور مہربان ہے۔

واقتلوھم حیث ثقفتموھم واخرجوھم من حیث اخرجوکم والفتنۃ اشد من القتل ولا تقاتلوھم عند المسجد الحرام حتیٰ یقاتلوکم فیہ فان قاتلوکم فاقتلوھم کذٰلک جزاء الکافرین۔[3]

اور ان مشرکین کو جہاں پاؤ قتل کر دو اور جس طرح انھوں نے تم کو آوارہ وطن کر دیا ہے تم بھی انھیں نکال باہر کر دو اور فتنہ پردازی تو قتل سے بھی بدتر ہے اور ان سے مسجد الحرام کے پاس اس وقت تک جنگ نہ کرنا جب تک وہ تم سے جنگ نہ کریں اس کے بعد جنگ چھیڑ دیں تو تم بھی چپ نہ بیٹھو اور جنگ کرو کہ یہی کافرین کی سزا ہے۔

ان دو آیتوں میں جہاں مشرکین سے جہاد کرنے کا حکم دیا ہے، اس جہاد کی شرائط بھی بیان کر دی ہیں۔ سورۂ توبہ آیت ۵ میں مشرکین سے جب تک وہ اسلام قبول نہ کرلیں جہاد کو جائز جانا ہے۔ اور سورۂ بقرہ کی

---

[1] توبہ/۱۲۳ [2] توبہ/۵ [3] بقرہ/۱۹۱

آیت ۱۹۱ میں جیسا حملہ ہو ویسا ہی جواب دینے کے لیے کہا گیا ہے مثلاً اگر مومنین کو کفار نے وطن سے نکال دیا ہے تو کفار کو بھی مومنین وطن سے نکال باہر کریں گے اور مسجد الحرام میں ہر چند لڑائی حرام ہے لیکن اگر مشرکین نے مومنین پر حملہ کر دیا اور انھیں قتل کرنے لگیں تو مسلمانوں کو بھی اجازت ہے کہ وہ بھی اپنا دفاع اور مشرکین سے جہاد کریں۔ لہٰذا یہ نتیجہ حاصل ہوتا ہے کہ اگر مسلمانوں کو دفاع کرتے ہوئے لڑنا پڑے تو یہ ہر صورت میں جائز ہے تمام زمانی اور مکانی شرائط میں جائز ہے خواہ حرام مہینے ہوں یا بیت اللہ الحرام ہو۔ مسلمانوں پر دفاع واجب قرار دیا گیا ہے۔

۱-۳-۶۔ ظالمین اور ستمگر افراد :

اذن للذین یقاتلون بانھم ظلموا و ان اللہ علی نصرھم لقدیر[1]

جن لوگوں سے مسلسل جنگ کی جا رہی ہے انھیں ان کی مظلومیت کی بنا پر جہاد کی اجازت دے دی گئی ہے اور یقیناً اللہ ان کی مدد پر قدرت رکھنے والا ہے۔

قرآن کریم بعد والی آیت میں مومنین پر ہونے والے مظالم کی نوعیت، جس کی وجہ سے ان کا جہاد کرنا جائز قرار پایا ہے، اس طرح بیان کرتا ہے۔

الذین اخرجوا من دیارھم بغیر حق الا ان یقولوا ربنا اللہ ولولا دفع اللہ الناس بعضھم ببعض لھدمت صوامع وبیع وصلوات و مساجد یذکر فیھا اسم اللہ کثیرا ولینصرن اللہ من ینصرہ ان اللہ لقوی عزیز[2]

یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے گھروں سے بلا کسی حق کے نکال دیے گئے ہیں۔ علاوہ اس کے کہ وہ یہ کہتے ہیں کہ ہمارا پروردگار اللہ ہے اور اگر خدا بعض لوگوں کو بعض کے ذریعہ نہ روکتا ہوتا تو تمام گرجے اور یہودیوں کے عبادت خانے اور مجوسیوں کے عبادت خانے اور مسجدیں سب منہدم کر دی جاتیں اور اللہ اپنے مددگاروں کی یقیناً مدد کرے گا کہ وہ یقیناً صاحب قوت بھی ہے اور صاحب عزت بھی۔

---

[1] حج/ ۳۹ [2] حج/ ۴۰

وما لکم لا تقاتلون فی سبیل اللہ والمستضعفین من الرجال والنساء والولدان الذین یقولون ربنا اخرجنا من ھذہ القریۃ الظالم اھلھا واجعل لنا من لدنک ولیا واجعل لنا من لدنک نصیرا۔[1]

اور آخر تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ کی راہ میں اور ان کمزور مرد، عورتوں، بچوں کے لیے جہاد نہیں کرتے ہو جنھیں کمزور بنا کر رکھا گیا ہے اور جو برابر دعا کرتے ہیں کہ خدایا ہمیں اس قریہ سے نجات دے دے جس کے باشندے ظالم ہیں اور ہمارے لیے کوئی سرپرست اور اپنی طرف سے مددگار قرار دیدے۔

وان طائفتان من المومنین اقتتلوا فاصلحوا بینھما فان بغت احدٰھما علی الاخریٰ فقاتلوا التی تبغی حتیٰ تفیٓء الیٰ امر اللہ فان فآءت فاصلحوا بینھما بالعدل واقسطوا ان اللہ یحب المقسطین۔[2]

اور اگر مومنین کے دو گروہ آپس میں جھگڑا کریں تو تم سب ان کے درمیان صلح کراؤ اس کے بعد اگر ایک دوسرے پر ظلم کرے تو سب مل کر اس سے جنگ کرو جو زیادتی کرنے والا گروہ ہے۔ یہاں تک کہ وہ بھی حکم خدا کی طرف واپس آجائے، پھر اگر پلٹ آئے تو عدل کے ساتھ اصلاح کر دو اور انصاف سے کام لو کہ خدا انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

۷۔ ملعون اور تباہ کار :

ملعونین اینما ثقفوا اخذوا وقتلوا تقتیلا۔[3]

یہ لعنت کے مارے ہوئے ہوں گے جہاں مل جائیں گرفتار کر لیے جائیں اور ان کے ٹکڑے ٹکڑے کر دے جائیں۔

---

[1] نساء/۷۵ [2] الحجرات/۹ [3] احزاب/۶۱

اس آیت میں ملعون افراد سے منافقین مُراد ہیں جو مدینہ میں اسلام کے خلاف پروپگینڈہ کیا کرتے تھے۔ خدا نے ان لوگوں سے جنگ وجہاد کرنے کا حکم دیا ہے۔

۸-۳-۱- پیمان شکن:

وان نکثوا ایمانھم من بعد عھدھم وطعنوا فی دینکم فقاتلوا

ائمۃ الکفر انھم لا ایمان لھم لعلھم ینتھون[1]

اور اگر یہ عہد کے بعد بھی اپنی قسموں کو توڑ دیں اور دین میں طعنہ زنی کریں تو کفر کے سربراہوں سے کھل کر جہاد کرو کہ ان کی قسموں کا کوئی اعتبار نہیں ہے، شاید یہ اسی طرح اپنی حرکتوں سے باز آجائیں۔

الا تقاتلون قوماً نکثوا ایمانھم وھموا باخراج الرسول وھم بدؤکم اول مرۃ[2]

کیا تم اس قوم سے جہاد نہ کروگے جس نے اپنے عہد و پیمان کو توڑ دیا اور رسول کو وطن سے نکال دینے کا ارادہ بھی کرلیا اور تمہارے مقابلہ میں مظالم کی پہل بھی کی۔

۴-۱- وہ آیات جو جہاد کی شرائط کو بیان کرتی ہیں:

ظاہر ہے کہ دینِ اسلام میں جنگ وخوں ریزی کی کہیں جگہ نہیں ہے بلکہ درحقیقت اسلام صلح و دوستی کی بنیاد پر استوار ہے اور خود قرآن یہ بات کہہ رہا ہے کہ صلح و دوستی، جنگ وخوں ریزی سے بہتر ہے۔[3] لیکن اسلام کے حق میں بعض غیر مسلم گروہوں کے نامناسب رویّہ کی بنا پر مسلمانوں کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہ جاتا کہ وہ ان کا مقابلہ کریں اور ان سے جہاد کریں۔ یہ بات گزشتہ آیات میں بیان ہو چکی ہے لیکن یہاں پر ہم ان حالات کو واضح طور پر بیان کریں گے جن کی بنا پر خدا نے مسلمانوں کو جہاد کا حکم دیا ہے۔

۱-۴-۱- اسلامی حکومت اور اسلامی معاشرہ پر حملہ کرنے والا گروہ (مقابلہ بہ مثل کی سیاست):

اہم ترین مورد جس میں مسلمانوں کو جہاد کا حکم دیا گیا ہے وہ امّت اسلامی کا دفاع ہے، مسلمانوں پر

---

[1] توبہ/۱۲ [2] توبہ/۱۳ [3] "والصلح خیر" نساء/۱۲۸

واجب ہے کہ اسلام کے دشمنوں کے حملہ کرنے پر اپنا دفاع کریں اور ان سے ڈٹ کر مقابلہ کریں۔ یہ معنی گزشتہ آیتوں میں گزر چکا ہے۔

وقاتلوا فی سبیل اللّٰہ الذین یقاتلونکم ولا تعتدوا ان اللّٰہ لایحب المعتدین[1]

جو لوگ تم سے جنگ کرتے ہیں تم بھی ان سے راہِ خدا میں جہاد کرو اور زیادتی نہ کرو کہ خدا زیادتی کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔

لاینھٰکم اللّٰہ عن الذین لم یقاتلوکم فی الدین ولم یخرجوکم من دیارکم ان تبروھم وتقسطوا الیھم ان اللّٰہ یحب المقسطین[2]

وہ تمہیں ان لوگوں کے بارے میں جنھوں نے تم سے دین کے معاملہ میں جنگ نہیں کی ہے اور تمہیں وطن سے نہیں نکالا ہے اس بات سے تمہیں روکتا ہے کہ تم ان کے ساتھ نیکی اور انصاف کرو کہ خدا انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

بعد والی آیت میں بھی مسلمانوں سے جنگ کرنے والوں کے ساتھ جہاد کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

انما ینھٰکم اللّٰہ عن الذین قاتلوکم فی الدین واخرجوکم من دیارکم وظاھروا علی اخراجکم ان تولوھم ومن یتولھم فاولئک ھم الظالمون[3]

وہ تمہیں صرف ان لوگوں سے روکتا ہے جنھوں نے تم سے دین میں جنگ کی ہے اور تمہیں وطن سے نکال باہر کیا ہے اور تمہارے نکالنے پر دشمنوں کی مدد کی ہے کہ ان سے دوستی کرو اور جو ان سے دوستی کرے گا وہ یقیناً ظالم ہوگا۔

۳۔۳۔ دینِ خدا کی مخالفت:

مشرکین جو اسلام اور اس کی اعلیٰ تعلیمات کے خلاف جنگ کرتے ہیں اور اعلیٰ اسلامی مقاصد کی

---

[1] بقرہ/۱۹۰ [2] ممتحنہ/۸ [3] ممتحنہ/۹

راہ میں رکاوٹیں کھڑی کرتے ہیں۔ ان کے خلاف اسلام نے جہاد کا حکم دیا ہے لیکن اگر یہ لوگ پُرامن زندگی گزاریں اور اسلام کی مخالفت نہ کریں اور اسلامی معاشرہ میں دینی قوانین کا احترام کریں تو اس صورت میں مسلمانوں کو ان سے کوئی سروکار نہ ہوگا۔ سورۂ توبہ کی آیت ۵ اس حکم کو بیان کرتی ہے۔ جو پہلے گزر چکا ہے اور ذیل کی آیت میں بھی اسی امر کا بیان ہے۔

فلا تتخذوا منهم اولياء حتّى يهاجروا في سبيل الله فان تولّوا فخذوهم واقتلوهم حيث وجدتموهم ولا تتخذوا منهم وليا ولا نصيرا[1]

خبردار تم انھیں اپنا دوست نہ بنانا جب تک راہِ خدا میں ہجرت نہ کریں۔ پھر یہ انحراف کریں تو انھیں گرفتار کرو اور جہاں پاجاؤ قتل کر دو اور خبردار ان میں سے کسی کو اپنا دوست اور مددگار نہ بنانا۔

۳-۴-۱۔ مومنین کے ساتھ منافقت اور انھیں اذیت اور آزار پہنچانا:

ستجدون آخرين يريدون ان يأمنوكم ويأمنوا قومهم كلّما ردّوا الى الفتنه اركسوا فيها فان لم يعتزلوكم ويلقوا اليكم السلم ويكفّوا ايديهم فخذوهم واقتلوهم حيث ثقفتموهم واولئكم جعلنا لكم عليهم سلطانا مبينا[2]

عنقریب تم ایک اور جماعت کو پاؤ گے جو چاہتے ہیں کہ تم سے بھی محفوظ رہیں اور اپنی قوم سے بھی، یہ جب بھی فتنہ کی طرف بُلائے جاتے ہیں اُلٹے اس میں اوندھے منہ گر پڑتے ہیں لہٰذا یہ اگر تم سے الگ نہ ہوں اور صلح کا پیغام نہ دیں اور ہاتھ نہ روکیں تو انھیں گرفتار کرو اور جہاں پاؤ قتل کر دو یہی وہ ہیں جن پر تمہیں کھلا غلبہ عطا کیا گیا ہے۔

۴-۴-۱۔ جن لوگوں سے جنگ کرنا جائز نہیں ہے:

جیسا کہ ذکر کیا جا چکا ہے کافرین سے جہاد کرنے کی شرائط میں سے ایک شرط ان کی پیمان شکنی ہے۔

---

[1] نساء/۸۹ [2] نساء/۹۱

لہٰذا ایسے کافروں سے، جنھوں نے مسلمانوں کے پاس پناہ لے رکھی ہے یا ان سے عہد و پیمان باندھ رکھے ہیں، ان سے جہاد کی اجازت نہیں دی گئی ہے، اور اللہ نے مسلمانوں کو حکم دے رکھا ہے کہ ان لوگوں سے امن اور بھائی چارہ سے پیش آئیں، ارشاد ہوتا ہے:

الا الذین یصلون الیٰ قوم بینکم و بینھم میثاق او جاءکم
حصرت صدورھم ان یقاتلوکم او یقاتلوا قومھم ولو
شاء اللہ لسلطھم علیکم فلقاتلوکم فان اعتزلوکم فلم
یقاتلوکم والقوا الیکم السلم فما جعل اللہ لکم علیھم سبیلا[1]

علاوہ ان کے جو ایسی قوم سے مل جائیں جن کے اور تمہارے درمیان معاہدہ ہو یا وہ تمہارے پاس دل تنگ ہو کر آجائیں کہ نہ تم سے جنگ کریں اور نہ اپنی قوم سے اور اگر خدا چاہتا تو ان کو تمہارے اوپر مسلط کر دیتا اور وہ تم سے بھی جنگ کرتے لہٰذا اگر تم سے الگ رہیں اور جنگ نہ کریں اور صلح کا پیغام دیں تو خدا نے تمہارے لیے ان کے اوپر کوئی راہ نہیں قرار دی ہے۔

وان احد من المشرکین استجارک فاجرہ حتیٰ یسمع کلام
اللہ ثم ابلغہ مأمنہ ذالک بانھم قوم لایعلمون[2]

اگر مشرکین میں سے کوئی تم سے پناہ مانگے تو اسے پناہ دے دو تاکہ وہ کتاب خدا سنے اس کے بعد اسے آزاد کر کے جہاں اس کی پناہ گاہ ہو وہاں پہنچا دو اور یہ مراعات اس لیے ہے کہ یہ جاہل قوم حقائق سے آشنا نہیں ہے۔

خدا نے کافرین اور مشرکین کے ان گروہوں کے ساتھ صلح رکھنے اور پرامن زندگی گزارنے کا حکم دیا ہے۔ وہ کفار و مشرکین جو مسلمانوں پر حملہ نہیں کرتے، وہ لوگ جو دین خدا کی مخالفت نہیں کرتے، وہ لوگ جو منافقانہ سیاستیں نہیں اپناتے اور مسلمانوں کو اذیت و آزار نہیں پہنچاتے، وہ لوگ جو مسلمانوں کے ساتھ اپنے عہد و پیمان پر باقی ہیں، وہ لوگ جو مسلمانوں کی پناہ میں ہیں، وہ لوگ جو اسلامی قوانین کا

---

[1] نساء/۹۰ [2] توبہ/۶

احترام کرتے ہیں اور جزیہ دیتے ہیں اور وہ لوگ جو تائب ہو کر دینِ خدا کو قبول کر چکے ہیں اور کفر و نفاق کو ترک کر چکے ہیں۔

۲۔ وہ آیات جو مسلمانوں کو جہاد کی تشویق کرتی ہیں اور جہاد کو مومنین کی برجستہ صفات اور اعلیٰ درجات کے حصول کی میزان بتاتی ہیں۔ یہ آیات حسبِ ذیل ہیں۔

ان اللہ یحب الذین یقاتلون فی سبیلہ صفاً کانھم بنیان مرصوص۔[۱]

بے شک اللہ ان لوگوں کو دوست رکھتا ہے جو اس راہ میں اس طرح صف باندھ کر جہاد کرتے ہیں جس طرح سیسہ پلائی ہوئی دیواریں۔

والذین آمنوا وھاجروا وجاھدوا فی سبیل اللہ والذین آووا ونصروا اولئک ھم المؤمنون حقاً لھم مغفرۃ ورزق کریم۔[۲]

اور جن لوگوں نے ایمان اختیار کیا اور ہجرت کی اور راہِ خدا میں جہاد کیا اور پناہ دی اور نصرت کی وہی درحقیقت واقعی مومن ہیں اور انھیں کے لیے مغفرت اور باعزت رزق ہے۔

الذین آمنوا وھاجروا وجاھدوا فی سبیل اللہ باموالھم وانفسھم اعظم درجۃ عند اللہ واولئک ھم الفائزون۔[۳]

بے شک جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے ہجرت کی اور راہِ خدا میں جان و مال سے جہاد کیا وہ اللہ کے نزدیک عظیم درجہ کے مالک ہیں اور درحقیقت وہی کامیاب بھی ہیں۔

وقاتلوا وقتلوا لاکفرن عنھم سیئاتھم ولادخلنھم جنات تجری من تحتھا الانھار ثواباً من عند اللہ واللہ عندہ حسن الثواب۔[۴]

اور انھوں نے جہاد کیا اور قتل ہو گئے تو میں ان کی برائیوں کی پردہ پوشی کروں گا اور انھیں

۱۔ صف/۴ ۲۔ انفال/۷۴ ۳۔ توبہ/۲۰ ۴۔ آل عمران/۱۹۵

ان جنتوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی۔ یہ خدا کی طرف سے ثواب ہے اور اسکے پاس بہترین ثواب ہے۔

اس آیت میں خدا کی راہ میں جہاد کرنے اور شہید ہونے کو گناہوں کی معافی بخشش اور جنت میں جانے کا سبب بتایا گیا ہے۔

ان اللّٰہ اشتریٰ من المؤمنین انفسھم و اموالھم بانّ لھم الجنّۃ یقاتلون فی سبیل اللّٰہ فیقتلون و یقتلون۔[1]

بیشک اللہ نے صاحبانِ ایمان کے جان و مال کو جنت کے عوض خرید لیا ہے۔ کہ یہ لوگ راہِ خدا میں جہاد کرتے ہیں اور دشمنوں کو قتل کرتے ہیں اور پھر خود بھی قتل ہو جاتے ہیں۔

اس آیت میں خدا جنت کے عوض مومنین کی جان و مال خریدنے کی بات کر رہا ہے وہ مومنین جو اس کی راہ میں جہاد کرتے ہیں۔

قل ان کان آباؤکم و ابناؤکم و اخوانکم و ازواجکم و عشیرتکم و اموال اقترفتموھا و تجارۃ تخشون کسادھا و مساکن ترضونھا احب الیکم من اللّٰہ و رسولہ و جھاد فی سبیلہ فتربصوا حتیٰ یأتی اللّٰہ بامرہ و اللّٰہ لا یھدی القوم الفاسقین۔[2]

پیغمبرؐ آپ کہہ دیجیے کہ اگر تمہارے باپ دادا، اولاد، برادران، ازواج، عشیرہ و قبیلہ اور وہ اموال جنہیں تم نے جمع کیا ہے اور وہ تجارت جس کے خسارہ کی طرف سے فکرمند رہتے ہو اور وہ مکانات جنہیں پسند کرتے ہو تمہاری نگاہ میں اللہ اس کے رسول اور راہِ خدا میں جہاد سے زیادہ محبوب ہیں تو وقت کا انتظار کرو یہاں تک کہ امرِ الٰہی آجائے اور اللہ فاسق قوم کی ہدایت نہیں کرتا۔

اس آیت میں قرآن نے خدا رسول اور جہاد فی سبیل اللہ اور دنیا کی مادی زندگی اور اس سے دل لگانے کے بیچ مقابلہ کیا ہے۔ اور اول الذکر امور کو دنیا کی ساری لذتوں پر ترجیح دی ہے۔

---

[1] توبہ/۱۱۱ [2] توبہ/۲۴

قرآن کریم راہِ خدا میں مرنے والوں کو زندہ کہتا ہے اور شہادت کو دنیا کی ساری مادی نعمتوں پر ترجیح دیتا ہے اور اس راہ سے مومنین کو جہاد اور شہادت کی تشویق دیتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

ولاتحسبن الذین قتلوا فی سبیل اللہ امواتاً بل احیاءٌ عند ربھم یرزقون[۱]

اور خبردار راہِ خدا میں قتل ہونے والوں کو مُردہ نہ سمجھنا وہ زندہ ہیں اور اپنے پروردگار کے یہاں رزق پا رہے ہیں۔

ولئن قتلتم فی سبیل اللہ او متم لمغفرۃ من اللہ و رحمۃ خیر مما یجمعون[۲]

اگر تم راہِ خدا میں مر گئے یا قتل ہو گئے تو خدا کی طرف سے مغفرت اور رحمت ان چیزوں سے کہیں زیادہ بہتر ہے جنہیں یہ جمع کرتے ہیں۔

اب تک جن آیات پر بحث کی گئی ہے ان میں اللہ مومنین کو اپنی راہ میں جہاد اور مبارزہ کا شوق دلاتا ہے۔ ذیل کی آیت میں یہ امر (جہاد کا حکم) الگ ایک صورت میں جلوہ گر ہے۔ وہ یہ ہے کہ میدان جنگ سے ڈر کر بھاگنے والے خدا کے غضب میں گرفتار ہوتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے۔

یاایھا الذین آمنوا اذا لقیتم الذین کفروا زحفاً فلا تولوھم الادبار ومن یولھم یومئذٍ دبرہ الا متحرفاً لقتالٍ او متحیزاً الی فئۃٍ فقد باء بغضب من اللہ ومأوٰہ جھنم وبئس المصیر[۳]

اے ایمان والو کفار سے جب میدانِ جنگ میں ملاقات کرو تو خبردار انھیں پیٹھ نہ دکھانا اور جو آج کے دن پیٹھ دکھائے گا وہ غضب الٰہی کا حق دار ہوگا اور اس کا ٹھکانہ جہنم ہوگا جو بدترین انجام ہے (علاوہ ان لوگوں کے جو جنگی حکمتِ عملی کی بنا پر پیچھے ہٹ جائیں یا کسی دوسرے گروہ کی پناہ لینے کے لیے اپنی جگہ چھوڑ دیں)

---

[۱] آل عمران/۱۶۹ نیز مضمون آیات سورۂ محمد/۴ - حج/۵۸ - بقرہ/۱۵۴ - نساء/۷۴ حدید/۱۰

[۲] آل عمران/۱۵۷

[۳] انفال/۱۵ - ۱۶

۳۔ وہ آیات جو جنگ میں مومنین کے لیے غیبی امداد اور نصرت کی بشارت دیتی ہیں: خدا کی طرف سے غیبی امداد مختلف صورتوں میں ظاہر ہوئی ہے۔ ہم اس مقام پر قرآن میں مذکور اہم غیبی امداد کی صورتوں کا جائزہ لیں گے۔

خدا نے قرآن میں متعدد جگہ مومنین کو کامیابی کی بشارت دی ہے اور کفار کو ذلیل اور شکست خوردہ جانا ہے۔ یہ امر سنت الہی ہے جو کہ قطعاً تغیر ناپذیر ہے یہ آیات حسب ذیل ہیں۔

لن یضروکم الا اذیً و ان یقاتلوکم یولوکم الادبار ثم لاینصرون[1]

یہ تم کو اذیت کے علاوہ کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے اور اگر تم سے جنگ بھی کریں گے تو میدان چھوڑ کر بھاگ جائیں گے۔ اور ان کی مدد بھی نہ کی جائے گی۔

ولو قاتلکم الذین کفروا لولوا الادبار ثم لایجدون ولیاً ولا نصیراً سنۃ اللہ التی قد خلت من قبل ولن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا[2]

اور اگر یہ کفار تم سے جنگ کرتے تو یقیناً منہ پھیر کر بھاگ جاتے اور پھر انھیں کوئی سرپرست اور مددگار نصیب نہ ہوتا یہ اللہ کی ایک سنت ہے جو پہلے بھی گزر چکی ہے اور تم اللہ کے طریقہ میں ہرگز کوئی تبدیلی نہیں پاؤ گے۔

ایک دوسری آیت میں مسلمانوں کی تعداد کی کمی کے باوجود فیصلہ کن جیت کو مسلمانوں کے لیے حتمی جانا ہے۔ خدا یہ ارشاد فرماتا ہے کہ اس حالت میں کہ کافرین تم سے دوگنی تعداد میں ہوں لیکن تم ان پر یقیناً غلبہ پاؤ گے۔ اس بنا پر واضح ہے کہ جہاد میں کامیابی کا سبب کثرت افراد نہیں ہے بلکہ صبر اور ایمان ہے جس سے کہ اسلام کے دشمن بے بہرہ ہیں۔

فان تکن منکم مائۃ صابرۃ یغلبوا مائتین وان تکن منکم الف یغلبوا الفین باذن اللہ واللہ مع الصابرین[3]

اگر تم میں سو صبر کرنے والے ہوں گے تو دو سو پر غالب آجائیں گے اور اگر ہزار ہوں گے تو

---

[1] آل عمران/۱۱۱ [2] فتح/۲۲-۲۳ [3] انفال/۶۶

بحکمِ خدا دو ہزار پر غالب آجائیں گے اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

اس آیت سے پہلے والی آیت میں کافرین کی تعداد کو مومنین سے دس گنا زیادہ بتایا ہے اور مومنین کی طاقت کو کافرین کی قوت سے دس گنا زیادہ بتایا ہے اس طرح کہ سو مومن ہزار کافروں پر غالب آسکتے ہیں لیکن اس کے بعد والی آیت میں یہ نسبت صرف دو گنا بتائی گئی ہے اس سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ یقیناً خدا پر ایمان اور احکامِ اسلامی کی پابندی دشمنوں پر فتح حاصل کرنے میں بنیادی اور اصلی کردار ادا کرتے ہیں۔

ایک اور آیت میں خدا مومنین کے جہاد کو اپنی طرف نسبت دیتا ہے اور اسے اپنی تائیدات کے سایہ میں قرار دیتا ہے۔

فلم تقتلوھم ولکن اللہ قتلھم وما رمیت اذ رمیت ولکن اللہ رمی[1]

پس تم لوگوں نے ان کفار کو قتل نہیں کیا ہے بلکہ خدا نے قتل کیا ہے اور پیغمبر آپ نے سنگریزے نہیں پھینکے ہیں بلکہ خدا نے پھینکے ہیں۔

قرآن میں غیبی مددوں میں ایک یہ بھی ہے کہ خدا نے مومنین کی نگاہ میں کافرین کو بہت کم دکھایا ہے تاکہ مومنین کے دل سے دشمن کا خوف نکال دے اور اس کے ساتھ ان کی جرأت اور شجاعت بڑھا کر انھیں اسلام دشمنوں کے خلاف جہاد کرنے پر آمادہ کرے۔

اذ یریکھم اللہ فی منامک قلیلاً ولو اراکھم کثیراً لفشلتم ولتنازعتم فی الامر ولکن اللہ سلّم انہ علیم بذات الصدور[2]

جب خدا ان کو تمہاری نظروں میں کم کرکے دکھلا رہا تھا کہ اگر زیادہ دکھلا دیتا تو تم سست پڑ جاتے اور آپس ہی میں جھگڑا کرنے لگتے۔ لیکن خدا نے تمہیں اس جھگڑے سے بچا لیا کہ وہ دل کے رازوں سے بھی باخبر ہے۔

واذ یریکموھم اذ التقیتم فی اعینکم قلیلاً ویقللکم فی اعینھم لیقضی اللہ امراً کان مفعولاً والی اللہ ترجع الامور[3]

اور جب خدا مقابلہ کے وقت تمہاری نظروں میں دشمنوں کو کم دکھا رہا تھا اور ان کی نظروں میں

---

[1] انفال/۱۷ [2] انفال/۴۳ [3] انفال/۴۴

تمہیں کم کر کے دکھلا رہا تھا تا کہ اس امر کا فیصلہ کر دے جو ہونے والا تھا اور سارے امور کی بازگشت اللہ ہی کی طرف ہے۔

خدا نے مومنین کی مدد کے لیے فرشتوں کو بھی بھیجا، امر جہاد میں ان کے حوصلے بڑھانے کی غرض سے تھا قرآن کریم میں چند آیتوں میں اس بات کا ذکر ملتا ہے۔

لقد نصرکم اللہ فی مواطن کثیرۃ و یوم حنین اذ اعجبتکم کثرتکم فلم تغن عنکم شیئاً و ضاقت علیکم الارض بما رحبت ثم ولّیتم مدبرین ثم انزل اللہ سکینتہ علی رسولہ و علی المومنین و انزل جنوداً لم تروھا و عذب الذین کفروا و ذالک جزاء الکافرین[1]

بے شک اللہ نے کثیر مقامات پر تمہاری مدد کی ہے اور حنین کے دن بھی جب تمہیں اپنی کثرت پر ناز تھا لیکن اس نے تمہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچایا اور تمہارے لیے زمین اپنی وسعتوں سمیت تنگ ہو گئی اور اس کے بعد تم پیٹھ پھیر کر بھاگ نکلے۔ پھر اس کے بعد خدا نے اپنے رسول اور صاحبان ایمان پر سکون نازل کیا اور وہ لشکر بھیجے جنہیں تم نے نہیں دیکھا اور کفر اختیار کرنے والوں پر عذاب نازل کیا کہ یہی کافرین کی جزا اور ان کا انجام ہے۔

ولقد نصرکم اللہ ببدر و انتم اذلۃ فاتقوا اللہ لعلکم تشکرون اذ تقول للمؤمنین الن یکفیکم ان یمدکم ربکم بثلاثۃ آلاف من الملائکۃ منزلین بلیٰ ان تصبروا و تتقوا و یأتوکم من فورھم ھذا یمددکم ربکم بخمسۃ آلاف من الملئکۃ مسومین و ما جعلہ اللہ الا بشریٰ لکم و لتطمئن قلوبکم بہ و ما النصر الا من عند اللہ العزیز الحکیم[2]

اور اللہ نے بدر میں تمہاری مدد کی ہے جب کہ تم کمزور تھے لہٰذا اللہ سے ڈرو شاید تم شکر گزار بن جاؤ۔ اس وقت جب آپ مومنین سے کہہ رہے تھے کہ کیا یہ تمہارے لیے کافی نہیں ہے کہ خدا

---

[1] توبہ/۲۵-۲۶ [2] آل عمران/۱۲۳-۱۲۶

تین ہزار فرشتوں کو نازل کرکے تمہاری مدد کرے یقیناً اگر تم صبر کروگے اور تقویٰ اختیار کروگے اور دشمن فی الفور تم تک آجائیں گے تو خدا پانچ ہزار فرشتوں سے تمہاری مدد کریگا جن پر بہادری کے نشان لگے ہوں گے اور اس امداد کو خدا نے صرف تمہارے لیے بشارت اور اطمینانِ قلب کا سامان قرار دیا ہے ورنہ مدد تو ہمیشہ صرف خدائے عزیز و حکیم ہی کی طرف سے ہوتی ہے۔

ولا تقتلوا انفسکم ان اللّٰہ کان بکم رحیماً [5]

خبردار اپنے نفس کو قتل نہ کرو اللہ تمہارے حال پر بہت مہربان ہے۔

ومن یقتل مؤمناً متعمداً فجزاءہ جہنم خالداً فیہا وغضب اللّٰہ علیہ ولعنہ واعد لہ عذاباً عظیماً۔ [6]

اور جو بھی کسی مومن کو قصداً قتل کرے گا اس کی جزا جہنم ہے اسی میں ہمیشہ رہنا ہے اور اس پر خدا کا غضب بھی ہے اور خدا لعنت بھی کرتا ہے اور اس نے اس کے لیے عذابِ عظیم مہیا کر رکھا ہے۔

وما کان لمؤمن ان یقتل مؤمناً الا خطأً ومن قتل مؤمناً خطأً فتحریر رقبۃ مؤمنۃ ودیۃ مسلّمۃ الیٰ اھلہ [7]

اور کسی مومن کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ کسی مومن کو قتل کرے مگر غلطی سے اور جو غلطی سے قتل کرے اسے چاہیے کہ ایک غلام آزاد کرے اور مقتول کے وارثوں کو دیت دے۔

اسلام میں قتل نفس حرام ہے اور اس کی اس قدر مذمت کی گئی ہے کہ خدا نے ایک نفس کے ناحق قتل کو سارے انسانوں کے قتل کے برابر بتایا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

اذ تستغیثون ربکم فاستجاب لکم انی ممدکم بالف من الملائکۃ مردفین وما جعلہ اللّٰہ الا بشریٰ ولتطمئن بہ قلوبکم وما النصر الا من عند اللّٰہ ان اللّٰہ عزیز حکیم [8]

جب تم پروردگار سے فریاد کر رہے تھے تو اس نے تمہاری فریاد سن لی کہ میں ایک ہزار ملائکہ

---

[5] نساء/۲۹ [6] نساء/۹۳ [7] نساء/۹۲ [8] انفال/۹-۱۰

سے تمہاری مدد کر رہا ہوں جو برابر ایک کے پیچھے ایک آرہے ہیں اور اسے ہم نے صرف ایک بشارت قرار دیا تاکہ تمہارے دل مطمئن ہو جائیں اور مدد تو صرف اللہ ہی کی طرف سے ہے اللہ ہی صاحب عزت اور صاحب حکمت ہے۔

۴۔ وہ آیات جو مسلمانوں کو ہر طرح کی ناحق جنگ اور خوں ریزی سے منع کرتی ہیں۔

گزشتہ بحثوں سے یہ معلوم ہوا کہ اللہ نے خاص حالات اور شرائط کے تحت ہی اسلام کے دشمنوں سے جہاد اور جنگ کو جائز و واجب جانا ہے۔ اس کے علاوہ مسلمانوں کو کسی کے ساتھ جنگ وقتال کا حکم نہیں ہے خواہ ان کے ایمانی بھائی ہوں یا وہ کفار جو مسلمانوں کے ساتھ صلح آمیز اور پُرامن زندگی گزارنا چاہتے ہوں اور دین اسلام کا احترام کرتے ہوں۔ اسلام نے برادر کشی اور ناحق خوں ریزی کو ناجائز قرار دیا ہے اور یہ کام اسلام کی نظر میں مذموم اور گھناؤنا ہے۔ اس امر کی طرف قرآن میں حسب ذیل آیات میں اشارہ کیا گیا ہے۔

ومن قتل نفساً بغیر نفس او فساد فی الارض فکانما قتل الناس جمیعاً۔[1]

جو شخص کسی نفس کو، کسی نفس کے بدلے یا روئے زمین میں فساد کی سزا کے علاوہ قتل کر ڈالے گا اس نے گویا سارے انسانوں کو قتل کر دیا۔

ولا تقتلوا النفس التی حرم اللہ الا بالحق۔[2]

اور کسی ایسے نفس کو جسے اللہ نے حرام کر دیا ہے قتل نہ کرنا مگر یہ کہ تمہارا کوئی حق ہو۔

ومن قتل مظلوماً فقد جعلنا لولیہ سلطاناً فلا یسرف فی القتل انہ کان منصوراً۔[3]

جو مظلوم قتل ہوتا ہے ہم اس کے ولی کو بدلہ کا اختیار دے دیتے ہیں لیکن اسے بھی چاہیئے کہ قتل میں حد سے آگے نہ بڑھ جائے کہ بہرحال اس کی مدد کی جائے گی۔



---

[1] مائدہ ر ۳۲ [2] انعام ر ۱۵۱ اسی مضمون کی آیت سورۂ فرقان کی آیت ۶۸ ہے [3] اسراء ر ۳۳

جناب ڈاکٹر سید جواد مصطفوی

تبلیغِ اسلام میں ہادیانِ دین کی روِش

جو کام اپنے فطری انداز میں انجام دیا جاتا ہے وہ بغیر کسی تکلف و زحمت کے انجام پاجاتا ہے اور پائیدار رہتا ہے اور جو چیز اپنی عادت و طبیعت کے خلاف ہو یا اپنے باطن کی حقیقت سے ہٹ کر خود کو نمایاں کرے اس کا باقی رہنا انتہائی دشوار اور مشکل ہوتا ہے۔ اور جلد یا بدیر "القسر لایدوم" کے قاعدہ کے مطابق نابود اور فنا ہو جاتی ہے۔

دینِ اسلام کائنات کی روشن تاریخ کا وہ برجستہ وقوعہ ہے جو چودہ سو سال پہلے وجود کے دامن پر نمایاں ہوا اور آج تک اپنی باعظمت حیات کو باقی رکھے ہوئے ہے۔ اس دین کو لانے والے اور اس کے تمام حامیوں اور ماننے والوں کا دعویٰ ہے کہ اس کے تمام اصول و فروع اور قوانین فطرت کے مطابق ہیں اور اس کے فطری اور خالص قوانین اگر کسی پاک و صاف طینت انسان کے سامنے پیش کیے جائیں تو وہ اس کو دل و جان سے قبول کرے گا اور مبلغ کو اپنی بات منوانے کے لیے کسی قسم کے حیلہ، بہانہ، مکر و فریب اور زحمت و مشقت اٹھانے کی ضرورت نہیں ہوگی۔

اس مقام پر ائمۂ اطہار صلوٰۃ اللہ علیہم اجمعین کی سادہ اور دل نشیں دعوت کے چند نمونے ملاحظہ ہوں۔

۱۔ دیصانی نامی ایک شخص جو خدا کا منکر تھا، امام صادق علیہ السلام کی خدمت میں آتا ہے اور کہتا ہے "میرے لیے خدا کو ثابت کیجئے۔"

امام علیہ السلام کی اس نشست میں ایک بچہ ایک انڈہ سے کھیل رہا تھا۔ آپؑ نے اس بچے سے وہ انڈہ لیا اور دیصانی سے فرمایا:

"اس انڈہ کو دیکھو۔ یہ ہر طرف سے محصور قلعہ کی مانند ہے۔ اس کے اوپر سخت چھلکا ہے جس کے نیچے نازک پردہ ہے اور درمیان میں طلائی اور نقرئی سیال ہے جو سیال ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے مخلوط نہیں ہوتا۔ اس کے اندر کسی کا ہاتھ نہیں پہنچا جو یہ کہے کہ اسے میں نے مکمل یا نامکمل بنایا ہے۔ اور کسی کو نہیں معلوم کہ اس میں نر چوزہ پرورش پا رہا ہے یا مادہ، اچانک ٹوٹتا ہے اور مختلف رنگوں والا مور جیسا چوزہ باہر نکل آتا ہے۔ آیا اس کے لئے کسی با تدبیر حاکم کی ضرورت ہے یا نہیں ——؟"

دیصانی نے سر جھکا لیا اور تھوڑی دیر غور و فکر کے بعد اپنے فطری ردِ عمل کا اظہار کیا اور خدائے واحد و لاشریک کا اقرار کر کے مسلمان ہو گیا۔[1]

میں سمجھتا ہوں کہ اگر اس بچے کے ہاتھ میں انڈہ کے بجائے انار، سیب یا کسی درخت کا کوئی پتہ یا چیونٹی یا چڑیا ہوتی تو امام علیہ السلام اسے اس کے ہاتھ سے لے کر دیصانی کو دکھاتے، خدا کی مخصوص حکمت و لطافت کو بیان فرماتے اور دیصانی کے سامنے اعتراف کرنے کے علاوہ کوئی اور چارہ نہ ہوتا۔

۲۔ امام صادق علیہ السلام ایک اور شخص کو گھر اور عمارت دکھا کر فرماتے ہیں:

"جس طرح یہ عمارت اپنے انجینیر اور مستری کے وجود پر دلالت کرتی ہے، اگرچہ تم نے انہیں نہیں دیکھا ہے، یہ کائنات کی عمارت بھی اپنے ستاروں، چاند، سورج، جمادات، نباتات اور انسان کے ساتھ اپنے فنکار اور بنانے والے خدا کے وجود پر دلالت کرتی ہے۔"[2]

۳۔ امام رضا علیہ السلام اپنے بدن شریف کی طرف اشارہ کر کے فرماتے ہیں:

"میں دیکھتا ہوں کہ میرا یہ بدن جو مخصوص طول و عرض والا ہے اسے میں نے خود نہیں بنایا ہے اور میں اس میں تبدیلی بھی نہیں لا سکتا جس سے پتہ چلتا ہے کہ اسے کسی دوسرے نے جس طرح چاہا بنا لیا ہے۔ اسی طرح ابر، ہوا، سورج، چاند اور تاروں کو دیکھتا ہوں تو ان کے لیے ایک

---

[1] اصول کافی جلد ۱ ص ۸۰ حدیث ۲۲۳۔ [2] اصول کافی جلد ۱ ص ۸۱ حدیث ۲۱۵۔

ماہر بنانے والا پاتا ہوں۔[۱]"

یہ ہے ائمہ معصومین علیہم السلام کی سادہ اور تکلف سے خالی دعوت کی روش۔

لیکن اگر کوئی چاہے کہ سورج، آتش اور بتوں کو خدا کی جگہ منوائے تو اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی گیہوں کہہ کر جَو یا جواہرات کہہ کر ٹھیکرے بیچے تو اسے بہت زیادہ حیلہ، بہانہ اور بازیگری کی ضرورت پیش آئے گی۔

پیغمبر اسلامؐ اور ائمہ طاہرین علیہم السلام کا دعویٰ ہے، بلکہ وہ انتہائی صاف و صریح لہجہ میں اعلان فرماتے ہیں کہ احکام اسلام کی تبلیغ اور اس کا بیان ہی ہماری ذمہ داری ہے۔ کائنات کے خالق اور ہم کو مبعوث کرنے والے نے ہمیں ایسا ہی حکم دیا ہے۔ ہم، لوگوں سے صرف پاک دل اور آلودگی سے محفوظ فطرت کے طلبگار ہیں اور اس کے بعد فکر کی آزادی، غور و خوض اور ہماری باتوں کا دوسروں کی باتوں سے موازنہ اور پھر بہتر کے انتخاب کے طالب ہیں۔

فبشر عباد الذین یستمعون القول فیتبعون احسنه[۲]:

اے پیغمبرؐ! آپ میرے ان بندوں کو بشارت دیدیں جو باتوں کو سنتے ہیں اور جو بات اچھی ہوتی ہے اس کا اتباع کرتے ہیں۔

ممکن ہے دوسرے مذاہب کے بعض مبلغین بھی یہی دعویٰ کریں اور یہی ان کی حیلہ گری اور بازیگری ہو۔ اس مقام پر موازنہ اور تحقیق کی ذمہ داری سننے والے پر ہے کہ وہ دیکھے ان میں سے کون سچ کہتا ہے اور کون دھوکا اور فریب سے کام لیتا ہے۔ کس کی دعوت فطرت کے مطابق اور کس کی دعوت فطرت کے خلاف ہے۔ اس قسم کے بعض باطل دعویداروں نے اپنی ننگ و عار سے پُر عمر گزار دی۔ انھوں نے کچھ دنوں اپنا وجود ثابت کیا، شور، ہنگامہ مچایا، لیکن مکتب کے رہنما اور اس کے پیروکار دونوں نیست و نابود ہو گئے اور تاریخ کا کوڑے دان ان کا مقام بن گیا۔ اب نہ اس مکتب کے لیے داعی باقی ہے اور نہ مبلغ اور اگر ایک آدھ ہوں بھی تو ان کی سنتا کون ہے۔

لیکن ہم مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ اسلامی قوانین سلیم انسانی فطرت اور عقل کے مطابق معین ہوئے ہیں، اسلامی قوانین اور انسانی فطرت، دونوں کا معین کرنے والا خدا ہے۔ اور آخر کار یہ کہ مسدود یں

---

[۱] اصول کافی جلد ۱ ص ۳۰، حدیث ۲۱۳۔ [۲] زمر / ۱۸۔

بعد سہی، شبہات و اعتراضات کا گرد و غبار دھل جائے گا اور حق کا نورانی چہرہ آشکار ہو جائے گا اور تمام لوگ اپنی پاک و سالم فطرت کی طرف پلٹیں گے اور اسلامی قوانین کو اپنی پاک فطرت کے مطابق پائیں گے اور حق کے آگے سر خم کر دیں گے۔ کیونکہ خالق کائنات اور پیغمبر اسلام نے خبر دی ہے کہ:

ھو الذی ارسل رسولہ بالھدیٰ و دین الحق لیظھرہ علی الدین کلّہ و لو کرہ المشرکون[1]

خدا ہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا تاکہ اپنے دین کو تمام ادیان پر غالب بنائے چاہے مشرکین کو کتنا ہی ناگوار کیوں نہ ہو۔

اس مقام پر بحث اسلام کے فروغ، اس کی ترقی اور اس کی دعوت کے سلسلہ میں ائمہ علیہم السلام کی دعوت کے طریقۂ کار اور اسلوب سے ہے۔ یہ ترقی اور فروغ طبیعی اور فطری انداز میں حاصل ہوا۔ کسی قسم کے دباؤ اور زور زبردستی کے ذریعہ نہیں۔ مبلغین اسلام نے نصیحت، موعظہ، حقائق کے بیان اور قوانین اسلام پر پابندی سے عمل کر کے اس مقدس دین کو پھیلایا اور پاک طینت طالبان حق نے اسے قبول کیا لیکن باطل دعویداروں نے کہ جن میں سے بہت سے ختم ہو چکے اور کچھ باقی ہیں انھوں نے اگر تھوڑے سے عرصہ کے لیے اقتدار حاصل کر بھی لیا تو طاقت، دباؤ اور زور زبردستی کے ذریعہ اپنے مخالفین کو خاموش کر دیا اور ان میں سے بعض افراد کا خیال تھا کہ اس طرح اگر زور زبردستی سے کچھ لوگوں نے ہمارا مذہب مان لیا تو وہ اسے ہمیشہ مانتے رہیں گے اور آنے والی نسلیں بھی ان کی پیروی کریں گی۔ لیکن انسان و جہان کے خالق، صاحب اقتدار خدا نے اپنی لامحدود قدرت و توانائی کے باوجود اپنے دین کی تبلیغ کے لیے اس سے ہٹ کر دوسرا راستہ اپنایا۔ خداوند عالم نے اس سلسلہ میں خلوص، اپنائیت، محبت اور نرمی و ملائمت کو منتخب کیا اور اس نے اسی راستہ کو صحیح و نتیجہ بخش جانا ہے۔ وہ ذات جس نے خود شیطان، فرعون اور نمرود کو پیدا کیا اور ان کا پورا اختیار اس کے قبضۂ قدرت میں ہے اور وہ اپنے ایک "کُن فیکون" کے ذریعہ انھیں دیار عدم کی سیر کرا سکتی ہے، وہ عظیم ہستی ان سے استدلال اور منطق کی زبان میں گفتگو کرتی ہے اور دلیل و برہان پیش کر کے ان سے ان کے دلائل کا مطالبہ کرتی

---

[1] صف / ۹

ہے تاکہ اس کے ذریعہ انھیں سوچنے اور حق و باطل کے درمیان موازنہ کرنے کا موقع ملے اور اس طرح ان پر حجت تمام ہو اور توبہ کا دروازہ ان پر کھل جائے۔ خداوند عالم اپنے رسولوں کو حکم دیتا ہے:

فقولا له قولا لينا لعلّه يتذكّر او يخشىٰ [۱]

آپ دونوں (موسیٰ و ہارون) اس (فرعون) سے نرمی سے گفتگو کریں، شاید وہ نصیحت حاصل کرے یا ڈر جائے۔

اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے فرماتا ہے:

فذكّر انّما انت مذكّر لست عليهم بمصيطر [۲]

تم صرف نصیحت کرنے والے ہو، تم ان پر مسلط نہیں ہو۔

وما انت عليهم بوكيل [۳] آپ ان کے ذمہ دار اور وکیل نہیں ہیں۔

فانّما عليك البلاغ [۴] آپ کا فرض صرف تبلیغ ہے۔

بیشک خداوند عالم اس بات سے واقف و آگاہ ہے کہ زور زبردستی اور خشونت کا الٹا نتیجہ نکلتا ہے۔ انسان کی خلقت اس طرح ہوئی ہے کہ وہ سخت کلامی اور درشتی سے بیان کیے گئے حق مطالب کو بھی قبول نہیں کرتا اور اس کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کرتا یا کم از کم تلخ کلام اور درشت خو مبلغ سے واسطہ پڑنے پر وہ اپنا ردعمل ظاہر کرتا اور انکار کرتا ہے اور اس کے برعکس کبھی کبھی نرم خو اور خوش اخلاق مبلغ سے باطل باتوں کو بھی مان لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خداوند عالم حق و صواب کی راہ دکھانے میں لطافت و ملائمت کا طریقہ اپناتا ہے اور اپنے رسولوں کو بھی اس کا حکم دیتا ہے۔ خدا چاہتا ہے کہ اس کے بندے اسلام کے امتیازات کو درک اور لمس کریں، اسے دل کی گہرائیوں سے قبول کریں تاکہ یہ حقیقت ان کے وجود کا جزو بن جائے بلکہ ان کا پورا وجود اور حقیقت و ماہیت اسی عقیدے سے تشکیل پائے۔

خدا اپنی دعوت اور تبلیغ کو موعظہ اور محبت و عاطفہ کے ذریعہ انجام دیتا ہے تاکہ بندے اس درجہ پر پہنچ جائیں، لیکن یہ تمام باتیں اسی وقت مؤثر ہو سکتی ہیں کہ جب تم مقابل حق کی تلاش میں ہو

---

[۱] طٰہٰ/۴۴۔ [۲] غاشیہ/۲۲۔ [۳] انعام/۱۰۷، ۱۱، شوریٰ/۶۔ [۴] آل عمران/۲۰۔

اور حق بات سننے پر آمادہ بھی ہو. ہم دیکھتے ہیں کہ ایسا شخص جس نے حق سمجھنے کے باوجود انکار کا رویہ اپنا رکھا ہے اس کے لیے بھی خدا نرم گفتاری سے کام لینے کا حکم دیتا ہے جیسا کہ فرعون کے سلسلے میں موسیٰ اور ہارون کو "قول لین" نرم لہجہ و بیان کی تاکید کرتا ہے. لیکن جب نرم روی، استدلال، برہان اور وعظ و نصیحت کسی طرح اثر نہیں کرتے تو سزا کے تازیانہ سے حقیقت کے متوالوں کی راہ روکنے والے کانٹے کو صاف کر دیتا ہے۔

مذکورہ بالا بیان اسلام کی گزشتہ سیاست اور اس کے کلی اور بنیادی خطوط سے متعلق تھا لیکن موجودہ حالت کا صدر اسلام سے موازنہ میرے ذہن میں ایک سوال پیدا کرتا ہے جسے چند تمہیدات کے ساتھ قارئین کرام کی خدمت میں پیش کرتے ہیں:

۱۔ اسلام کی نشر و اشاعت تدریجی اور زینہ بہ زینہ تھی یعنی اس کی ابتدا صفر سے ہوئی۔ اول خدیجہ پھر دوسرے لوگ ایک ایک کر کے ایمان لاتے اور مسلمان ہوتے رہے۔ یہاں تک کہ ۲۳ سال کی مدت میں آنحضرتؐ کی دعوت سے ہزاروں لوگ دائرۂ اسلام میں داخل ہو گئے جن میں سے ہر ایک نے وراثت اور سماج سے متاثر ہوئے بغیر اسلام قبول کیا تھا۔

۲۔ ہمارے زمانے میں اسلام کی طرف آنا اور یہودیت و عیسائیت سے دین اسلام کی طرف بازگشت' تقریباً محال سمجھا جاتا ہے۔ حتیٰ اگر کسی صدی میں اس طرح کے ایک یا دو مورد دیکھے گئے تو لوگ اس کے سیاسی، اقتصادی اور جنسی اسباب و وجوہ تلاش کرتے ہیں اور بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ اس بازگشت کو تحقیق و تلاش حق کا نتیجہ سمجھا جائے کہ اس شخص نے اپنے خاندانی اور آبائی دین میں نقص و عیب اور اسلام میں خوبی و فضائل دیکھے ہیں جیسا کہ صدر اسلام میں ہوتا تھا۔

۳۔ اسلام کی نشر و اشاعت معجزہ کے ذریعہ نہیں تھی، بلکہ خود پیغمبر اسلام بھی تبلیغ، مناظرہ اور جہاد کرتے تھے اور اس کے لیے سفر کی صعوبتیں بھی برداشت کرتے تھے تب کہیں جا کر ایک آدمی ایمان لاتا اور بقیہ اینٹ پتھر مارتے اور آپ کو دیوانہ و جادوگر کہتے۔

۴۔ اسلام نظم و ضبط اور قوانین و احکام کی پابندی کی دعوت دیتا ہے جو کہ انسان کی نفسانی خواہشات کے بالکل برخلاف ہے اور یہ بات انتہائی جرأت سے کہی جا سکتی ہے کہ اسلام کے علاوہ تاریخ کے دامن میں کوئی ایسا دین و مذہب نہیں جو عبادی، اخلاقی، سیاسی اور سماجی قوانین کی پابندی پر

اس قدر زور دیتا ہو۔ لہٰذا ماننا پڑے گا کہ صدرِ اسلام کی ایک ایک فرد جس نے بے دینی یا کسی خاص دین سے ہجرت کر کے اسلام قبول کیا ہے، اس نے دیدہ و دانستہ آزادی سے قید و محدودیت اور پابندی کی طرف قدم بڑھایا ہے اور اپنے ارادہ و اختیار سے آزادی اور راحت و آرام چھوڑ کر محدودیت و پابندی کو قبول کیا ہے لہٰذا اس انتخاب کو ایک عیسائی کے مادہ پرست ہو جانے یا ایک مسلمان کے ہپی ازم یا اسی طرح کے دوسرے مکتب فکر کو اپنانے سے موازنہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس طرح کی تجدید نظر بہت آسان ہے کیونکہ یہ محدودیت اور پابندی سے جان چھڑانا ہے اور وہ بھی اپنی نفسانی خواہش کے مطابق۔ صدرِ اسلام میں مسلمان ہونا یا کسی بھی زمانہ میں کسی مذہب سے دینِ اسلام کے دائرہ میں قدم رکھنا، یہ واقعاً حیرت انگیز ہے حیرت اس بات پر ہے کہ انسان اپنے ارادہ و اختیار سے محدودیت اور پابندی کو گلے لگاتا ہے۔

ان چار مختصر تمہیدوں کے بیان سے وہ نکتہ سامنے آگیا جو میرے ذہن میں برابر کھٹک رہا ہے کہ آجکل کے لوگوں کا اسلام کو قبول کرنا کیونکر محال ہے جبکہ صدرِ اسلام میں یہی بات بہت معمولی تھی اور آسانی سے روز افزوں ترقی پا رہی تھی۔

ممکن ہے کوئی بغیر سوچے سمجھے یہ کہے کہ پیغمبرِ اسلام معنوی طاقت، ربانی قدرت اور معجزہ کے مالک تھے لہٰذا اس زمانہ کے ان امتیازات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے۔ یہی چیزیں ہیں جنھوں نے آج کے محال کو کس ممکن بنا دیا تھا لیکن حقیر کی گزارش ہے کہ یہ لوگ اپنی دلیل کی قوت، کسی عادت کو ترک کرنے میں لوگوں کے برابر اور مساوی ہونے اور ابتدا میں دعوت کی مشکلات اور چودہ صدیاں گزرنے کے بعد اس کے آسان ہونے کے بارے میں غور و فکر کریں۔

اس مقام پر اور بھی بہت سے نظریات پیش کیے جاتے ہیں لیکن ان تمام نظریات کا بغور جائزہ لینے کے بعد میری نظر میں جو محال تھا وہ ممکن سے قریب نہ ہو پایا۔ ہم پیغمبرِ اسلام کو ان کی رسالت کے آغاز میں دیکھتے ہیں کہ غذا کا انتظام کر کے اپنے رشتہ داروں کو دعوت دیتے ہیں اور ان کے سامنے اپنی الٰہی رسالت کو رکھتے ہیں۔ اس نشست میں صرف ایک علی ابن ابی طالب آپ کی آواز پر لبیک کہتے ہیں اور بقیہ سر جھٹک کر چلے جاتے ہیں بلکہ آپ کے چچا ابو لہب نے آپ کو بہت سخت و سست بھی کہا۔

آپ اس زمانہ کے بادشاہوں کو خط لکھ کر انھیں اسلام کی دعوت دیتے ہیں جن میں سے کچھ

نے اپنا میلان ظاہر کیا اور کچھ نے خط ہی پھاڑ کر پھینک دیا۔

یہ تمام باتیں اس بات کی روشن دلیل ہیں کہ خداوند عالم نے اسلام کو لوگوں کے درمیان طبیعت اور معمول کے مطابق پھیلانے کا ارادہ کیا ہے ان معجزات کے ذریعہ نہیں جو آنحضرتؐ سے صادر ہوئے ہیں تاریخ گواہ ہے کہ معجزات کے مثبت اثرات دیکھنے میں نہیں آتے بلکہ معجزہ کو دیکھنے کے بعد لوگوں نے آپؐ کی طرف جادو اور سحر کی نسبت دی ہے۔ چنانچہ قرآن مجید معجزات کا مشاہدہ کرنے والوں کی اس طرح ترجمانی کرتا ہے:

وان یروا آیۃ یعرضوا و یقولوا سحر مستمر [1]

یہ کوئی بھی نشانی دیکھتے ہیں تو منہ پھیر لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ ایک جادو ہے جو ہمیشہ رہا کیا ہے۔

یہودی عورت جو آپؐ کی ہمسایہ ہے اور آپؐ سے اس کے بغض و عناد کا یہ عالم ہے کہ جب آپؐ باہر نکلتے ہیں تو آپؐ پر کوڑا پھینکتی ہے، جب وہ بیمار ہو جاتی ہے اور آپؐ اس کی عیادت کے لیے تشریف لے جاتے ہیں تو وہ مسلمان ہو جاتی ہے۔ یا یہ کہ آپؐ نو مسلم جوان کو اس کی مشرک ماں کے احترام کی تاکید فرماتے ہیں اور جب اسے آپؐ کی اس تاکید کا علم ہوتا ہے تو وہ اسلام لے آتی ہے۔ علی بن ابیطالب علیہ السلام غیر مسلم ہمسفر کی مشایعت فرماتے ہیں جس کے نتیجہ میں وہ ایمان لے آتا ہے۔ امام باقر، امام صادق اور امام رضا علیہم السلام کافروں کے سامنے انتہائی ملائمت اور نرم گفتاری سے وجودِ خدا پر دلیل و استدلال پیش فرماتے ہیں جس کے نتیجہ میں وہ مسلمان ہو جاتے ہیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ پیغمبر اسلامؐ اور ائمہ طاہرین علیہم السلام کے ہاتھوں مسلمان ہونے والے ان ہی فطری اور معمولی طریقوں سے مسلمان ہوئے ہیں جو دوسروں کے لیے بھی ممکن ہیں چنانچہ یہ حالات بعض علمائے اسلام کے سامنے بھی پیش آئے لیکن ہمارے اس زمانہ میں ایسے حالات بہت کم پیش آتے ہیں

اس انتخاب کے مقابلہ میں اپنی حیرت کے اظہار کے لیے ایک دوسری مثال کا سہارا لیتے ہیں۔ مثلاً ہم مسلمان اس بات کے دعویدار ہیں کہ تمام اسلامی قوانین فطرتِ انسان کے مطابق معین ہوئے ہیں۔

---

[1] القمر ر ۲۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ مثلاً دنیا بھر کے صرف مسلمانوں نے تیل، چاول، سیب وغیرہ کو بطور خوراک چنا ہے جو انسانی معدہ، دل، گردہ، جگر اور روح سے سازگار ہے۔ دوسرے لوگ جو تعداد میں مسلمانوں سے کہیں زیادہ ہیں، وہ اس فائدہ مند خوراک کے بجائے بھوسا، پیال اور درخت کی چھال اور پتے کھاتے ہیں، گویا تو وہ اپنی غلطی کی طرف متوجہ نہیں ہیں یا یہ کہ متوجہ ہیں مگر اپنی کج روی اور اشتباہ پر قائم رہنا چاہتے ہیں۔ آپ یقین جانیں کہ نہ راقم، نہ قاری اور نہ کوئی ایک مسلمان بھی اپنے دین کے دوسرے ادیان سے موازنہ میں اس مثال سے تھوڑا سا بھی پیچھے ہٹنے کے لیے تیار ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ وہ لوگ جنھیں ہم پاگل بھی نہیں سمجھتے، اس قسم کا انتخاب کیونکر کرتے ہیں۔ اور اس نظر بندی اور مغالطہ کاری کا سرچشمہ کہاں ہے؟ راقم کی نگاہ میں اس مشکل کو حل کرنے کے لیے مقالہ نویسی کا مقابلہ رکھا جائے اور بہترین مقالہ لکھنے والے کو مناسب انعام دیا جائے۔

بادی النظر میں ممکن ہے یہ کہا جائے کہ مسلمان تو خود اپنے دینی قوانین پر عمل نہیں کرتے۔ وہ لوگ سیب، چاول اور تیل کی خوبیاں بیان تو کرتے ہیں لیکن خود کچھ اور کھاتے ہیں۔ ظاہر ہے دوسرے لوگ بھی مسلمانوں کے عمل اور خوراک کو دیکھتے ہیں نہ کہ ان کی باتوں اور زبان کو۔ بلکہ کبھی دیکھا گیا ہے دوسرے لوگوں نے سیب وغیرہ کا انتخاب دوسرے دین کے نام پر کیا ہے اور وہ دیکھتے ہیں کہ مسلمان مقام عمل میں اپنی باتوں کے برخلاف انداز اختیار کرتے ہیں۔

ظاہر ہے تمام مسلمان ایسے نہیں ہیں۔ ان کے درمیان تقویٰ اور فضائل کے نمونۂ عمل علماء اور غیر علماء پائے جاتے ہیں۔ یہ لوگ بھی سماج میں ہیں اور تبلیغ و دعوت کو اپنا وظیفہ جانتے ہیں اور اچھی باتوں پر ایمان اور یقین رکھتے ہیں لیکن اس کے باوجود محسوس اثرات اور نتائج دکھائی نہیں دیتے۔

اس سلسلہ میں حقیر کی ناچیز رائے یہ ہے کہ مبلغین، پیغمبر اسلامؐ اور ائمۂ اطہار علیہم السلام کے احتجاجات و مناظرات کا دقتِ نظر سے مطالعہ کریں اور ان کی باریکیوں اور نکات کا تجزیہ کریں اور انھیں راہ تبلیغ میں بروئے کار لائیں۔

۱۔ رہبرانِ دین کے مناظرات کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ حضرات اپنے مدمقابل کو خود ذکر کرنے کا موقع دیتے تھے، خلوص و صمیمیت کی فضا قائم کرتے تھے۔ ان کی باتوں کو بڑے حوصلے سے اول سے آخر تک سنتے تھے تاکہ وہ اطمینان سے اپنے دل کی باتوں کو بیان کرسکیں اور وہ کسی

خوف اور تقیہ کے بغیر اپنا مافی الضمیر بیان کریں بلکہ یہ احساس کریں کہ مبلغ اسلام اسے آزادی سے سوچنے کا موقع دے رہا ہے اور کسی قسم کی زور زبردستی نہیں ہے۔ اگر ایسا شخص حق کو قبول کرنے کے لیے آمادہ ہو اور بغض و عناد سے خالی ہو تو وہ حق بات کی مٹھاس اور لذت کو محسوس کرتا ہے۔ پھر وہ حق کو قبول کرنے سے رک نہیں سکتا۔ لیکن اگر ایسے حالات نہ ہوں تو پھر دعوت کے اثر کی امید نہیں رکھنا چاہیے۔

اس قسم کے احتجاج کے دو نمونے ذکر کیے جا رہے ہیں:

الف:— پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت کا پہلا سال تھا۔ آپ کچھ افراد کے ساتھ کعبہ کے دروازہ پر بیٹھے ہوئے تھے اور ان کے سامنے آیاتِ قرآن کی تلاوت فرما رہے تھے۔ قریش کے بزرگوں کی ایک جماعت مثلاً ولید، ابوجہل، عاص، ابوالبختری اور ابن امیہ جیسے صاحبانِ قدرت و طاقت یہ منظر دیکھتے ہیں تو آپس میں باتیں کرتے ہیں کہ محمدؐ کی دعوت اور ان کی کوششیں بارآور ہو رہی ہیں۔ مسجد میں بیٹھ کر لوگوں کو بت پرستی سے روکتے ہیں۔ چلتے ہیں اور ان سے مناظرہ کر کے ان کی زبان بند کر دیتے ہیں اور ان کے دعویٰ کو باطل کرتے ہیں تاکہ ان کی سبکی ہو اور وہ اپنی باتوں سے دستبردار ہو جائیں۔ اور اگر پھر بھی نہ مانیں تو پھر ہم تلوار سے ان کی خبر لیں گے۔

ابوجہل نے پوچھا۔ "ان سے کون مجادلہ کرے گا؟"

ابن امیہ نے کہا: "میں تیار ہوں۔"

سب متفق ہو کر آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ابن امیہ نے بات شروع کی اور کہا:

"اے محمدؐ، تم نے بہت بڑا دعویٰ کیا ہے اور بڑی وحشت انگیز باتیں کرتے ہو۔ تمہیں گمان ہے کہ تم پروردگار عالم کے رسول ہو جب کہ خدا کے لیے زیب نہیں دیتا کہ وہ تم جیسے انسان کو جو کھانا کھاتا اور بازار میں ٹہلتا ہے اپنا رسول بنائے۔ کیا تم نے روم و فارس کے بادشاہوں کو نہیں دیکھا کہ جب وہ کسی کو اپنا نمائندہ بنانا چاہتے ہیں تو ایسے اشخاص کا انتخاب کرتے ہیں جو دولت مند، محلوں والے اور غلاموں کی کثیر تعداد کے مالک ہوتے ہیں۔ پروردگار عالم جو تمام بادشاہوں سے بالاتر ہے، اسے اور بہتر شخص کو اپنا نمائندہ بنانا چاہیے۔ اس کے علاوہ اگر تم رسول ہو تو تمہارے ساتھ ایک فرشتہ ہونا چاہیے جسے ہم دیکھیں اور وہ تمہاری تصدیق کرے یا یہ کہ خدا تمہارے بجائے کسی فرشتے کو بھیج دے۔

اور تم پر تو جادو کیا گیا ہے، تم رسول نہیں ہو۔"

آنحضرتؐ نے پوچھا: "کیا تمہیں اور بھی کچھ کہنا ہے؟"

اس نے کہا" ہاں، اور وہ یہ ہے کہ اگر خدا کسی کو رسول بنا کر بھیجنا ہی چاہتا تو وہ ولید بن مغیرہ، یا عروہ بن مسعود کو منتخب کرتا جو مکہ اور طائف کے ثروت مند شخص ہیں۔"

آپ نے پوچھا۔" اور بھی کچھ کہنا ہے؟"

اس نے کہا:" ہاں ہم تم پر ایمان لائیں گے مگر یہ کہ تم ہیں ایک ابلتا ہوا چشمہ نکالو تا کہ ہم لوگ پانی کی کمی سے نجات پا جائیں یا خرما اور انگور سے لدا ہوا باغ ظاہر کرو جس میں سے تم خود بھی کھاؤ اور ہمیں بھی کھلاؤ۔ یا ہمارے سر پر آسمان گرا دو یا خدا کو اس کے تمام فرشتوں کے ساتھ ہمارے سامنے حاضر کرو یا یہ کہ تمہارا گھر جواہرات سے بھرا ہو اور ہم کو دو تا کہ ہم دولت مند ہو جائیں اور تمہارے خیال کے مطابق اپنے عقائد سے سرکشی کریں یا ہمارے سامنے تم آسمان پر جاؤ اور خدا کے دستخط سے ایک خط لے آؤ جس میں مجھ سے اور میرے ساتھیوں سے خطاب کر کے کہا گیا ہو کہ محمدؐ پر ایمان لے آؤ کہ وہ میرے رسول ہیں۔ اور اگر تم نے یہ سب کام انجام بھی دے لیے تو بھی ہم تم پر ایمان نہ لائیں گے بلکہ اگر ہمیں آسمان پر لے چلو اور اس کے دروازے ہم پر کھول کر ہمیں داخل کر دو تو ہم یہی کہیں گے کہ تم نے جادو کیا ہے اور ہماری نظر بندی کر دی ہے۔"

آپ نے پھر پوچھا: "تمہیں اور بھی کچھ کہنا ہے؟"

ابن امیہ نے کہا:" کیا اتنا کافی نہیں ہے۔ اب مجھے کچھ نہیں کہنا ہے۔ تمھیں کچھ کہنا ہو تو کہو۔ اپنی دلیلیں بیان کرو اور جو کچھ تم سے کہا ہے اسے انجام دو۔"

اس وقت آنحضرتؐ نے آسمان کی طرف رخ کر کے کہا۔

"پالنے والے تو ہر بات کو سنتا ہے اور ہر چیز سے واقف ہے۔ تیرے بندے جو کچھ کہتے ہیں، اس سے آگاہ ہے۔"

پھر آپ نے قرآن کی کچھ آیتیں تلاوت فرمائیں جو کفار کی باتوں کا جواب تھیں[1] اور فرمایا:

---

[1] اسراء/۹۳ تا ۹۶۔